بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روشنی اور رفعت کا نشان

المنار

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

جلد ۱۰ | جنوری فروری مارچ ۱۹۶۶ء | شمارہ ۱

نگران

چوہدری محمد شریف خالد ایم اے ایل ایل بی

مدیران

- منیر الحق شاہد بی اے
- محمد سمیع طاہر
- مبارک احمد سیف
- حافظ حبیب علی عاصم
- ظہیر الدین منصور احمد

پرنٹر و پبلشر رقیہ ہاشمی - مقام اشاعت تعلیم الاسلام کالج ربوہ - کتابت احمد حسین - مطبع ضیاء الاسلام پریس ربوہ

عکس

- ادارتیہ ......
- تبرکات ......
- طلباء کی سرگرمیاں ......
- مقالات و مضامین

سودا اور اس کی شاعری .... حافظ عباس علی صنم
اداس میں علم و فنون کی ترقی .... میر [illegible]
جوہر کا جمال .... منصور امیر
زندگی .... محمد سمیع طاہر
جدید طبیعات .... لطیف گجراتی
ایک یادگار سفر .... ادہاف احمد

اور دیگر

- افسانے

حادثہ .... محمود سلیم
- غلطی .... زکریا جاوید
- بہاریں پھر بھی آئیں گی .... سمیع طاہر
- منظومات و غزلیات

اللہ تعالیٰ .... چوہدری محمد شریف صاحب خالد ایم۔اے
غزل .... حضرت قاضی محمد ظہور الدین صاحب اکمل رض
مجبوری .... مکرم مصلح الدین صاحب راجیکی م
غزل .... چوہدری محمد علی صاحب ایم۔اے
غزل .... الحاج چوہدری شبیر احمد صاحب
غزل .... چوہدری ناصر احمد صاحب پرویز پروازی اور دیگر

اداریہ

ادارتی گزارشات } شمارہ پیشِ خدمت ہے اگر اس میں کوئی خوبی نظر آئے تو سمجھیں یہ آپ کی دریافت ہے اور اس پر آپ ہماری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔ خوبی کی دریافت ایک ملکہ ہے۔ اور یہ ہر اس آدمی میں پایا جاتا ہے جو مثبت رجحان رکھتا ہو منفی کی بجائے مثبت پہلو کی طرف مائل ہونا ایک نہایت قیمتی وصف ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

ستاروں میں حسن ہے نہ ہے خورشید و ماہ میں
کچھ ہے اگر تو دیکھنے والی نگاہ میں

غیر سرکاری کالج اور محکمہ تعلیم } یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ تعلیم کے میدان میں غیر سرکاری کالج نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ جہالت کے اندھیروں کو علم کی ضیاؤں سے منور کرنے کے لئے یہ ادارے اپنے وسائل کی کمی کے باوجود قابلِ ستائش خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ باوجودیکہ آئینی، سیاسی اور اخلاقی اقدار کے مطابق ہر شہری کی مناسب تعلیم و تربیت کا انتظام حکومت کے ذمہ ہے۔ حکومت ان کم وسائل والے مگر مفید اداروں کی امداد اس حد تک نہیں کر رہی جس حد تک کہ وہ سرکاری کالجوں کی کر رہی ہے۔ حالانکہ غیر سرکاری کالج بعض حالات میں سرکاری کالجوں کی نسبت تعلیمی لحاظ سے بہت آگے ہیں۔ مثال کے طور پر لاہور کے بعض کالج صرف ان طلباء کو داخل کرتے ہیں جن کی سابقہ امتحانوں میں اعلیٰ فرسٹ ڈویژن ہوتی ہے۔ اس کے بالمقابل بعض غیر سرکاری کالجوں میں وہ طلباء آ جاتے ہیں جن کو کالج داخلہ قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ لیکن جب سالانہ نتائج نکلتے ہیں تو ان غیر سرکاری کالجوں کے نتائج بسا اوقات سرکاری کالجوں سے اچھے ہوتے ہیں۔ ان حالات میں ہم محکمہ تعلیم سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ کیا ابھی وقت نہیں کہ محکمہ اپنے اس سلوک پر نظر ثانی کرے اور غیر سرکاری کالجوں کی امداد میں فراخدلی سے کام لے۔ (نگران)

عزیز ساتھیو! ہم مکتبو! کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ جس کالج میں آپ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اس کا قیام کیسے ہوا۔ یہ وہ کالج ہے جس کی بنیاد خداتعالیٰ کے ایک نبی کے ہاتھوں رکھوائی گئی۔ آج سے تقریباً ۶۳ سال قبل قادیان کی بستی میں نبی آخرالزمان کے کامل ظل اور اسلام کے بطل جلیل نے ارادہ کیا کہ مدرسہ تعلیم الاسلام کو کالج کے معیار تک بلند کیا جائے چنانچہ یونیورسٹی سے منظوری حاصل کر کے انٹر کلاسز کا اجرا کیا گیا۔ اس کالج کے افتتاح کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ میں تو بیت الدعا میں جا کر دعا کروں گا اور حضرت حکیم مولانا نورالدین صاحب جا کے تقریب پر تشریف لے جا کر افتتاح فرما دیں۔ چنانچہ مقررہ وقت پر ایک ساتھ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی دعاؤں اور حضرت خلیفۃ المسیح الاول کے افتتاحی خطاب سے اس مقدس کالج کا افتتاح ہوا۔

پیارے بھائیو! اس سے بڑھ کر آپ کی خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ کو اس کالج میں تعلیم حاصل کرنے کی توفیق ملی ہے جس میں پڑھنے والوں اور پڑھانے والوں کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنے رب سے انتہائی دعائیں کی ہیں۔ خدا کے نبی کی دعاؤں کے مورد ہم اسی وقت بن سکتے ہیں جب اس کالج کے قیام کی اغراض کو پورا کرنے والے ہوں۔ جیسا کہ نام بتاتا ہے یہ کالج تعلیم اسلام کے پڑھنے پڑھانے اور ترویج کے لئے قائم کیا گیا تھا اس میں پڑھنے والوں اور پڑھانے والوں سے یہ توقع کی گئی تھی کہ وہ اسلام کے بہادر سپاہی بنیں گے۔ اسلامی تعلیم کے ماہر بنیں گے۔ اسلامی اخلاق میں نمونہ ثابت ہوں گے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ طلباء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"یہ تعلیم الاسلام کالج ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کالج تمہیں عملی مسلمان بنائے گا۔ اور یہی اس کالج کے قائم کرنے کی غرض ہے"

پھر اسی طرح فرمایا:

"ہم نے یہ کالج دین کی تائید کے لئے بنایا ہے اگر کسی وقت محسوس ہو کہ یہ کالج بجائے

دین کی تائید کرنے کے بجائے بے دینی کا ایک ذریعہ ثابت ہو رہا ہے تو ہم ہزار گنا یہ زیادہ بہتر سمجھیں گے کہ اس کالج کو بند کر دیں بجائے اس کے کہ بے دینی اور خلافِ مذہب حرکات کو برداشت کریں۔"

اب ہمیں چاہیئے کہ ہم قرآن کریم کے پڑھنے پڑھانے میں بے رغبتی کا اظہار نہ کریں۔ تعلیم اسلام کے سیکھنے میں سستی کاہلی یا تغافل نہ کریں تا اس کالج کے قیام کا مقصد فوت نہ ہو۔ خدا تعالیٰ آپ کو بھی اور مجھ کو بھی توفیق عطا فرمائے۔ آمین (شاہد)

طالب علمی کا زمانہ بھرپور تمناؤں اور آرزوؤں کا زمانہ ہوتا ہے۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جہاں سے کسی انسان کے عروج و زوال کی حدیں شروع ہوتی ہیں۔ کالج میں طلباء پڑھنے کے لئے آتے ہیں۔ آداب و اخلاق جاننے کے لئے داخل ہوتے ہیں۔ ہر طالب علم کا فرض ہے کہ وہ اپنے بنیادی مقصد حصولِ تعلیم کو کبھی اپنے ذہن سے فراموش نہ ہونے دے۔

ایک اچھا طالب علم وہی ہے جو کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ جملہ مصروفیات میں حصہ لے۔ اگر ایک طالب علم امتحانات میں بہت اچھے نمبر لیتا ہے لیکن کالج کی دوسری مصروفیات میں شامل نہیں ہوتا تو اس کی تعلیم ادھوری رہتی ہے۔ ایک اچھے طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ پڑھائی کے ساتھ کھیل کے میدان میں بھی نظر آئے۔ اور علمی محفلوں میں بھی وہ دیکھا جائے۔

غرض اچھے طالب علم میں ہر قسم کی خوبیاں ہونی چاہئیں۔ اسے اپنا وقت بہترین مصارف میں لگانا چاہیئے۔ پڑھنے کے وقت وہ پڑھ رہا ہو اور کھیلنے کے وقت وہ کھیل رہا ہو۔ اوقات مقرر ہونے سے زندگی ایک پروگرام کے تحت بسر ہوتی ہے اور انسان مطمئن رہتا ہے۔

طلباء میں ایک عادت ہوتی ہے وہ اپنے مستقبل کے بارے میں بڑے بڑے خواب دیکھتے ہیں۔ لیکن اپنے آئیڈیل کے حصول کے لئے اتنی کوشش نہیں کر رہے ہوتے جتنی کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو ابتدا ہی سے ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے وہ انسان اپنے مقصد کے حصول کے لئے اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب وہ اپنے کاموں میں پوری محنت صرف کرے۔ کیونکہ بقول اقبال ؎

نقش ہے سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر ۔ نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

(طاہر)

عزیز ساتھیو! کالج کی زندگی سکول سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ انسان دس سال کی قید کے بعد رہائی حاصل کرتا ہے۔ اگرچہ آزادی انسان کا حق ہے لیکن بعض اوقات انسان آزادی کو منفی رنگ میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر انسان کو کچھ پابندیوں سے آزاد کر دیا جائے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ سوچ و بچار کے ذریعہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی منزل کا راستہ متعین کرے اور نسبتاً آزادانہ طور پر اس کے لئے سعی و جہد کرے۔

ایک طالب علم کا کام پڑھنا اور علم حاصل کرنا ہے۔ آپ اپنے نصاب کی کتابیں ضرور پڑھیں۔ لیکن علم صرف نصاب کی کتابوں کا نام نہیں۔ دوسرے علوم کی کتابوں کے مطالعہ کی طرف بھی ضرور توجہ دیں۔ یاد رکھئے کہ پڑھنا اور صرف پڑھنا ہی کافی نہیں، پڑھائی کے ساتھ کچھ لوازمات بھی ہوتے ہیں۔ جو پڑھائی میں آپ کی مدد کرتے ہیں اور ایک طالب علم کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔

آپ پڑھنے کے ساتھ ساتھ دوسرے مشاغل کی طرف بھی توجہ دیں۔ کوشش کریں کہ ہر روز کوئی نہ کوئی کھیل ضرور کھیلیں۔ اس سے نہ صرف آپ کے جسم کی نشوونما ہوتی ہے بلکہ آپ کے ذہن کا بوجھ بھی ہلکا ہو جاتا ہے اور آپ کی ذہنی صلاحیتیں ترقی کرتی ہیں۔

آپ کھیل کے علاوہ کالج کی مجالس میں بھی ضرور شرکت کریں۔ دوسروں کی نگارشات سے ضرور مستفیض ہوں اور کوشش کریں کہ آپ صرف سامعین میں نہ رہیں بلکہ آپ کا نام مقررین میں بھی ہو۔ تقریر کرنا بھی ایک فن ہے جو آئندہ زندگی میں آپ کے لیے بہت مفید ہے۔ اس مفید فن کو بھی اپنانے کی کوشش کیجئے۔

یاد رکھئے کہ المنار آپ کا اپنا رسالہ ہے۔ یہ ایک فرد کا نہیں بلکہ سارے کالج کا رسالہ ہے آپ اس کو اپنی زیادہ سے زیادہ نگارشات بھجوائیں اور اس کو معیاری بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

ہم ان اصحاب کا شکریہ ادا کرتے ہیں جن کی نگارشات زیر نظر شمارے میں شائع ہو رہی ہیں اور ان اصحاب کا بھی شکریہ ادا کرتے ہوئے معذرت کا اظہار کرتے ہیں جن کی نگارشات اس شمارہ میں جگہ نہ پا سکیں۔

(مصنف)

اگر آپ چاہتے ہیں کہ زندگی اپنی پوری رعنائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ آپ کے سامنے جلوہ گر ہو تو محنت کی عادت ڈالیئے۔ مسلسل اور لگاتار جدوجہد کیجئے۔ جس مقصد کی خاطر آپ اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں تشریف لائے ہیں اس مقصد کے حصول کی خاطر رات دن ایک کر دیجئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب آپ سخت محنت کے عادی ہو جائیں گے۔ اس وقت زندگی کا ہر لمحہ مسرت انگیز ہوگا اور آپ کا دامن خوشیوں سے بھر جائے گا۔ لیکن اگر آپ محنت سے جی چراتے رہے، سستی اور کاہلی کا شکار ہو گئے تو آپ کی زندگی کا ہر لمحہ تیرہ و تاریک ہو جائے گا اور یہ زندگی آپ کے لیے وبالِ جان بن جائے گی۔

تاریخ عالم میں صرف انہی اقوام کا ذکر موجود ہے جنہوں نے مسلسل جدوجہد اور لگاتار محنتوں سے حالات کا رخ بدل دیا۔ تاریخ کے اوراق صرف انہی اقوام کو جگہ دیتے ہیں۔ جو عملِ پیہم اور ان تھک محنت کی عادی ہوتی ہیں۔

عزیز ساتھیو! حالات خود کبھی سازگار نہیں ہوتے بلکہ سازگار بنائے جاتے ہیں۔ اگر آپ حالات کے سازگار ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ تو یقیناً زمانہ آپ کو پیچھے چھوڑ دے گا۔ اور آپ اس شخص کی مانند جو اپنے کارواں سے بچھڑ جائے بھٹکتے پھریں گے۔

اگر آپ زمانے کی تیز رفتاری کا ساتھ دینا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کی خواہش ہے کہ آنے والی نسلیں آپ کے کارناموں پر فخر کریں اور عزت و احترام کے ساتھ آپ کا نام لیں۔ ان کا گردنیں آپ کے لئے احتراماً جھک جائیں تو محنت کی عادت ڈالیئے۔ سستی کاہلی اور تن آسانی سے کنارہ کیجئے۔

زندگی کے میدان کارزار میں بے شمار مصائب آپ کا راستہ روکیں گے۔ قدم قدم پہ آپ کو ناگہانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حالات کی ناسازگاری آپ کی راہ میں حائل ہوگی۔ سنگدل بے رحم موجیں اپنے سخت تھپیڑوں سے آپ کی کشتی حیات کو الٹنے کی کوشش کریں گی مصائب کی آندھیاں آپ کی زندگی کے چراغ کو بجھانے کی کوشش کریں گی۔ اور تندیٔ بادِ مخالف

اگر آپ چاہتے ہیں کہ زندگی اپنی پوری رعنائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ آپ کے سامنے جلوہ گر ہو تو محنت کی عادت ڈالئے۔ مسلسل اور لگاتار جدوجہد کیجئے۔ جس مقصد کی خاطر آپ اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں تشریف لائے ہیں اس مقصد کے حصول کی خاطر دن رات ایک کر دیجئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب آپ سخت محنت کے عادی ہو جائیں گے۔ اس وقت زندگی کا ہر لمحہ مسرت انگیز ہوگا اور آپ کا دامن خوشیوں سے بھر جائے گا۔ لیکن اگر آپ محنت سے جی چراتے رہے، سستی اور کاہلی کا شکار ہو گئے تو آپ کی زندگی کا ہر لمحہ تیرہ و تاریک ہو جائے گا اور یہ زندگی آپ کے لئے وبالِ جان بن جائے گی۔

تاریخ عالم میں صرف انہی اقوام کا ذکر موجود ہے جنہوں نے مسلسل محنتوں اور لگاتار حملوں سے حالات کا رخ بدل دیا۔ تاریخ کے اوراق صرف انہی اقوام کو جگہ دیتے ہیں۔ جو عمل پیہم اور ان تھک محنت کی عادی ہوتی ہیں۔

عزیز ساتھیو! حالات خود کبھی سازگار نہیں ہوتے بلکہ سازگار بنائے جاتے ہیں۔ اگر آپ حالات کے سازگار ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ تو یقیناً زمانہ آپ کو پیچھے چھوڑ دے گا۔ اور آپ اس شخص کی مانند جو اپنے کارواں سے بچھڑ جائے بھٹکتے پھریں گے۔

اگر آپ زمانے کی تیز رفتاری کا ساتھ دینا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کی خواہش ہے کہ آنے والی نسلیں آپ کے کارناموں پر فخر کریں اور عزت و احترام کے ساتھ آپ کا نام لیں۔ ان کی گردنیں آپ کے لئے احتراماً جھک جائیں تو محنت کی عادت ڈالئے۔ سستی کاہلی اور تن آسانی سے کنارہ کیجئے۔۔۔۔

زندگی کے میدان کارزار میں بے شک مصائب آپ کا راستہ روکیں گے۔ قدم قدم پہ آپ کو ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حالات کی ناسازگاری آپ کی راہ میں حائل ہوگی۔ سمندر کی بے رحم موجیں اپنے سخت تھپیڑوں سے آپ کی کشتی حیات کو الٹنے کی کوشش کریں گی مصائب کی آندھیاں آپ کی زندگی کے چراغ کو بجھانے کی کوشش کریں گی۔ اور تندیٔ باد مخالف

آپ کی پرواز میں حائل ہونے کی کوشش کرے گی۔ تاہم آپ ان مشکلات سے دل برداشتہ نہ ہوں۔ ان مصائب کو دیکھ کر آپ کا دل کہیں ہمت نہ ہار دے اور کہیں امید کا دامن آپ کے ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے۔

یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

(عاصم صابرؔ)

—•—

زندگی میں وہی لوگ کامیاب و کامران ہوتے ہیں جن میں کام کرنے کا شوق جذبہ اور لگن ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو کام کرنے سے جی چراتے ہیں اور سستی اور کاہلی کا شکار ہو جاتے ہیں، زندگی کے میدان میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے ان کا دامن کبھی خوشیوں سے نہیں بھر سکتا بلکہ ان کی ساری زندگی کانٹے چننے میں بسر ہو جاتی ہے۔ اور وہ آخر کار ناکام و نامراد اس دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں۔

پس ہمارا فرض ہے کہ ہم کام کرنے کا شوق اور لگن پیدا کریں۔

محنت کرو عزیزو محنت سے کام ہوگا
کہتے ہیں بخت جس کو آکر غلام ہوگا

(ذ طیبہ)

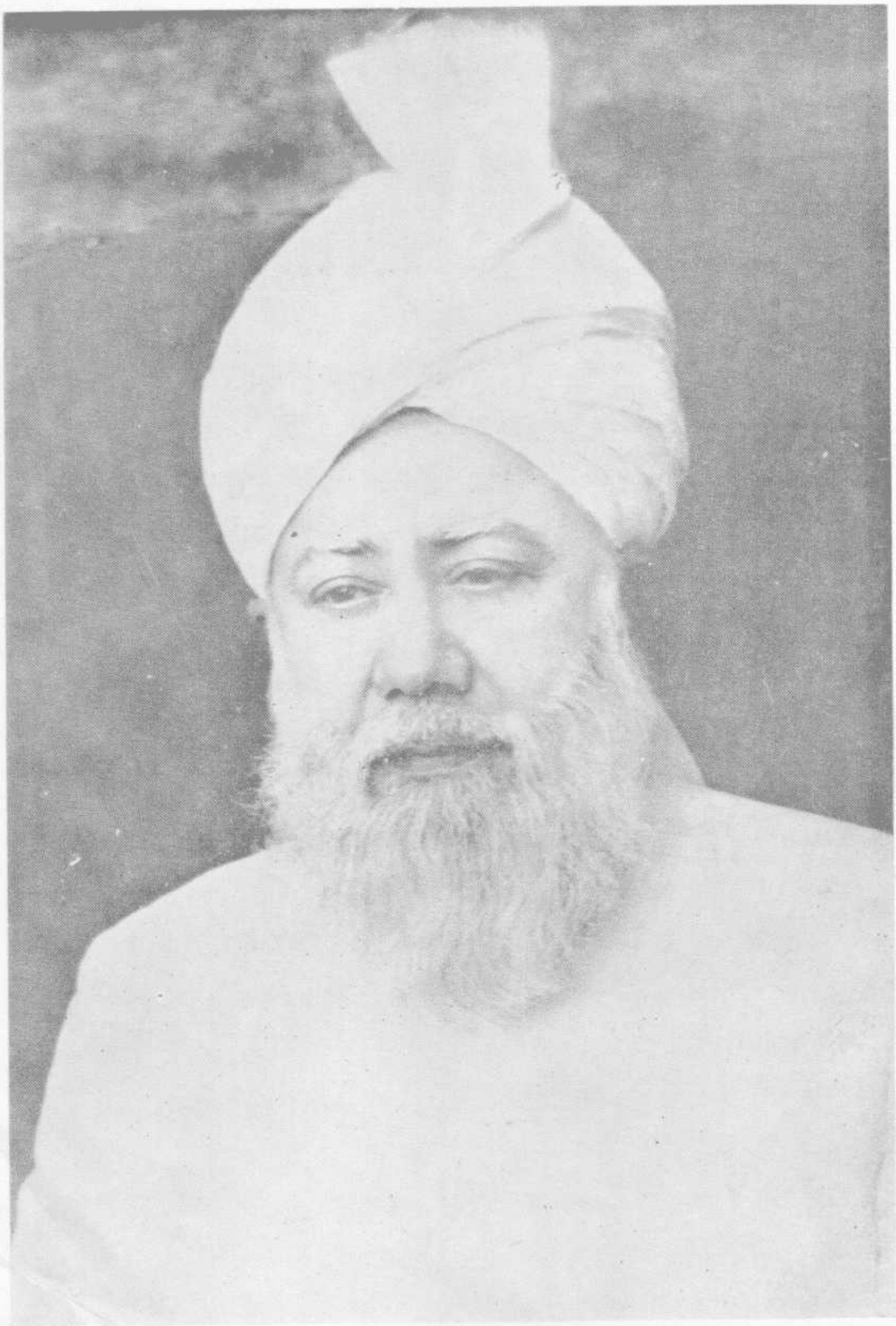

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ایدہ اللہ بنصرہ العزیز

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝

(سورۃ الصف)

ترجمہ:-

زمین و آسمان کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہیں اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم وہ باتیں کیوں کہتے ہو جو تم خود نہیں کرتے (یاد رکھو) خدا تعالےٰ کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے کہ تم وہ باتیں کہو جن پر تم خود عمل نہیں کرتے۔

قَالَ الرَّسُوْلُ

عَنْ وَابِصَةَ ابْنِ مَعْبَدٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ اَتَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ جِئْتَ تَسْئَلُ عَنِ الْبِرِّ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ اسْتَفْتِ قَلْبَكَ اَلْبِرُّ مَا اطْمَاَنَّتْ عَلَیْهِ النَّفْسُ وَاطْمَاَنَّ اِلَیْهِ الْقَلْبُ وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِی النَّفْسِ وَتَرَدَّدَ فِی الصَّدْرِ وَاِنْ اَفْتَاكَ النَّاسُ وَاَفْتَوْكَ

ترجمہ:- حضرت وابصہ بن معبد رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا تو حضورؐ نے فرمایا۔ کیا تو نیکی کے بارے میں سوال کرنے آیا ہے۔ میں نے کہا ہاں۔ آپؐ نے فرمایا اپنے دل سے فتویٰ طلب کر۔ نیکی وہ ہے جس پر تیرا نفس مطمئن ہوا اور دل بھی اس کی طرف (مائل ہوکر) مطمئن ہوا۔ اور گناہ وہ ہے جو تیرے نفس میں کھٹکے اور سینے میں تردد پیدا کرے۔ خواہ لوگوں نے تجھے (اس کے خلاف) بتایا اور بار بار (یہی کیوں نہ) بتایا۔

کلام حضرت مسیح موعود علیہ السلام

کَلَامُ الْاِمَام

کس قدر ظاہر ہے نُور اُس مبدا الانوار کا
بن رہا ہے سارا عالم آئینہ ابصار کا

چاند کو کل دیکھکر میں سخت بیکل ہو گیا
کیونکہ کچھ کچھ تھا نشاں اس میں جمالِ یار کا

چشمۂ خورشید میں موجیں تری مشہود ہیں
ہر ستارے میں تماشہ ہے تیری چمکار کا

تُو نے خود روحوں پہ اپنے ہاتھ سے چھڑکا نمک
جس سے ہے شورِ محبت عاشقانِ زار کا

خوبرویوں میں ملاحت ہے ترے اس حُسن کی
ہر گُل و گلشن میں ہے رنگ اس ترے گلزار کا

چشمِ مست ہر حسیں ہر دم دکھاتی ہے تجھے
ہاتھ ہے تیری طرف ہر گیسوئے خم دار کا

ہیں تری پیاری نگاہیں دلبرا اک تیغ تیز
جس سے کٹ جاتا ہے سب جھگڑا غم اغیار کا

تیرے ملنے کے لئے ہم مل گئے ہیں خاک میں
تا گر درماں ہو کچھ اس ہجر کے آزار کا

شور کیسا ہے ترے کوچہ میں لے جلدی خبر
خوں نہ ہو جائے کسی دیوانہ مجنوں وار کا

کلام حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ

امام الکلام

کوئی گیسو مرے دل سے پریشاں ہو نہیں سکتا
کوئی آئینہ مجھ سے بڑھ کے حیراں ہو نہیں سکتا

کوئی یادِ خدا سے بڑھ کے مہماں ہو نہیں سکتا
وہ ہو جس خانۂ دل میں وہ ویراں ہو نہیں سکتا

الٰہی پھر سبب کیا ہے کہ درماں ہو نہیں سکتا
ہمارا دردِ دل جب تجھ سے پنہاں ہو نہیں سکتا

کوئی مجھ سا گنہ ہوں پر پشیماں ہو نہیں سکتا
کوئی یوں غفلتوں پر اپنی گریاں ہو نہیں سکتا

چھپا ہے ابر کے پیچھے نظر آتا نہیں مجھ کو
میں اس کے چاند سے چہرہ پہ قرباں ہو نہیں سکتا

خدارا خواب میں ہی آکے اپنی شکل دکھلا دے
بس اب تو صبر مجھ سے اے مری جاں ہو نہیں سکتا

وہاں ہم جا نہیں سکتے یہاں وہ آ نہیں سکتے
ہمارے درد کا درماں کوئی بھی ہو نہیں سکتا

چھپیں وہ لاکھ پردوں میں ہم ان کو دیکھ لیتے ہیں
خیالِ روئے جاناں ہم سے پنہاں ہو نہیں سکتا

اسلامی نماز

ان ظاہری افعال کے علاوہ اسلامی نماز اللہ تعالیٰ کی تسبیح تحمید اور تعظیم کے ایسے مضامین پر مشتمل ہے جو سنگدل سے سنگدل انسان کے دل کو بھی نرم کر دیتی ہے۔ اور اس میں ایسی دعائیں رکھی گئی ہیں جو انسانی فکر کو بہت بلند کر دیتی ہیں اور اس کے مقاصد کو اونچا کر دیتی ہیں۔ اور اس کے جذبات کو نیکی اور تقوے کے لئے ابھار دیتی ہیں اور خدا تعالیٰ کی محبت کی آگ بھڑکا دیتی ہیں۔ اور روحانی حصہ نماز کا یہی ہیں۔ اور ان کا دوسری اقوام کی عبادات سے اگر مقابلہ کیا جائے تو دونوں میں وہی نسبت معلوم ہوتی ہے۔ جیسے سورج کے مقابلہ پر مٹی کا ایک دیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے کہ اسلام نے عبادات کو تمام ظاہری دلکشیوں سے خالی رکھا ہے نہ اس وقت گانا ہوتا ہے نہ باجا ہوتا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر دوسری اقوام کی اجتماعی عبادتوں میں ہوتا ہے۔ بلکہ فقط سنجیدگی سے اللہ کے بندے اس کے حضور اپنی عقیدت کے پھول پیش کرتے ہیں اور اس کی محبت کی بھیک مانگتے ہیں۔ اور باوجود اس کے نماز ہفتہ میں ایک وقت ادا نہیں کی جاتی جیسا کہ اکثر مذاہب میں ہے۔ بلکہ دن میں کم از کم پانچ مرتبہ پڑھی جاتی ہے۔ مگر پھر بھی اس بے دینی کے زمانہ میں بھی اس قدر مسلمان پانچ وقت کی نمازیں ادا کرتے ہیں کہ دوسرے تمام مذاہب کے افراد ملا کر ہفتہ میں ایک دفعہ کی عبادت بھی اس تعداد میں ادا نہیں کرتے۔ یہ نماز کی روحانی کشش کا ایک بیّن ثبوت ہے اور مشاہدہ اس پر گواہ ہے۔

دوسری عبادت گاہوں میں باجے بجتے ہیں گانے گائے جاتے ہیں۔ آرام کے لئے کرسیاں اور صوفے مہیا کئے جاتے ہیں۔ اور صرف ہفتہ میں ایک بار بلایا جاتا ہے لیکن لوگ پھر بھی ان سے دور بھاگتے ہیں۔ لیکن یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کے مخاطب سخت زمین پر سجدہ کرنے کے لئے پانچ وقت مساجد میں شوق سے جمع ہوتے ہیں اور بغیر کسی ظاہری دلکشی کے اور بغیر کسی مادی آرام کے سامان کے موجود ہونے کے وہ لذت اور سرور محسوس کرتے ہیں کہ دنیا کی سب نعمتیں اس کے آگے ماند ہوتی ہیں۔ اس مشاہدہ کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ اسلامی عبادت صرف چند ظاہری رسوم کا مجموعہ ہے۔ اور اس میں روحانیت کی نسبت جسمانی ہیئتوں کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ علم النفس اس پر شاہد ہے اور تجربہ

بتا رہا ہے کہ اسلامی عبادت کی ظاہری شکل صرف ایک برتن کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ ورنہ اس کا مغز تو وہ پُر معارف مضامین ہیں جو اس میں دہرائے جاتے ہیں۔ اور وہ پُر شوکت دعائیں اور وہ پُر سوز التجائیں ہیں جو اس میں کی جاتی ہیں۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو عبادت کا حکم دینے سے کیا فائدہ؟ کیا وہ بندوں کی عبادت کا محتاج ہے تعظیم اور تکریم سے تو نادان انسان خوش ہوا کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی ذات کو تو اس سے ارفع ہونا چاہیئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عبادت کا فائدہ یہ نہیں کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی شان بڑھتی ہے بلکہ عبادت کی غرض اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان ایسا اتصال پیدا کرنا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے نور کو اپنے اندر اخذ کر لے۔ اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صرف فکر انسان کے اندر وہ جذبہ پیدا نہیں کر سکتا جس سے وہ خدا تعالیٰ کی ذات میں اپنے آپ کو محو کرنے کی کوشش کرے۔ ایسا جذبہ تو محبت کامل سے ہی پیدا ہو سکتا ہے اور محبت کامل حسن ہستی کے احسانوں کے کامل انکشاف سے پیدا ہوتی ہے اور نماز اس غرض کو پورا کرتی ہے۔ کیونکہ نماز میں اللہ تعالیٰ کی حقیقی شان کو سامنے لانے کے لئے سامان مہیا کئے جاتے ہیں۔ اگر کہو کہ جو انسان اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنا چاہے گا وہ خود ہی اپنے لئے اس کا موقعہ نکال لے گا۔ اس کے لئے پانچ وقت کی نماز مقرر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض قلت تدبر سے پیدا ہوا ہے۔ انسانی طبیعت اس قسم کی ہے کہ اگر باقاعدگی سے اسے اس کے مقصد کی طرف توجہ نہ دلائی جائے تو وہ سستی کرنے لگتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے کمزور اور قوی سب کو اس اعلیٰ مقام تک پہنچنے کے لئے نماز باجماعت ادا کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ کمزور بھی قوی کے ساتھ مل کر ان مواقع کو پاتے رہیں۔ جو ان کے دلوں کے اندر صفائی پیدا کریں۔ اور قوی ایمان والوں کے دلوں سے نکلنے والی مخفی تاثیرات کو اپنے اندر جذب کر کے صفائی قلب پیدا کر سکیں۔

(تفسیر کبیر جلد اول، جزو اول مصنفہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۱۱۸ تا ۱۲۰)

نماز کے متعلق

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد

نماز کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ
مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ

جس نے نماز کو جان بوجھ کر نماز کو چھوڑا اس نے کفر کیا۔

(حدیث)

عبد الهادی ناصر ایم-اے

حدیث کے لغوی و اصطلاحی معانی

لفظ حدیث "حدث" سے مشتق ہے۔ اس کے لغوی معنی نئی چیز یا نئی بات کے ہیں۔ اسی طرح ایک معنی کسی بھی شخص کی بات یا قول کے ہیں۔ حدیث کی جمع احادیث ہے۔ (اقرب الموارد)

قرآن کریم میں بھی لفظ حدیث اپنے لغوی معنوں میں متعدد آیات میں استعمال ہوا ہے مثلاً (سورہ جاثیہ ع ۱) میں ہے۔

فبای حدیث بعد اللہ وایاتہ یومنون (جاثیہ)

ترجمہ:۔ پس اللہ تعالےٰ اور اس کی آیات کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے۔

نیز فرمایا:۔

واذا اسر النبی الی بعض ازواجہ حدیثاً (تحریم)

ترجمہ:۔ جب نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے پوشیدہ طور پر اپنی بیوی سے ایک بات کہی۔

ان آیات میں حدیث سے مراد کوئی بیان، بات، یا قول ہے۔ اصطلاحاً لفظ حدیث اب ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ:۔

حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا فعل یا تقریر

ہر زبان کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ جب کوئی لفظ اصطلاحی طور پر خاص معنوں میں اس قدر مشہور ہو جائے کہ اس کے لغوی معنی بظاہر نظر انداز ہو جائیں تو پھر جب بھی وہ لفظ بغیر کسی قرینہ کے استعمال میں آئے جس سے ثابت ہو سکے کہ یہ لفظ اپنے لغوی معنوں میں استعمال ہو رہا ہے ہمیشہ اس کے اصطلاحی معنی مراد لئے جائیں گے۔ خصوصاً عربی زبان میں کثیر تعداد ایسے الفاظ کی ہے۔ جو لغوی سے زیادہ اپنے اصطلاحی معنوں میں مشہور ہو گئے ہیں۔ مثلاً صلوٰۃ کا لفظ ہے اس کے معنی دعا کے ہیں۔ لیکن اصطلاحی طور پر ایک خاص طریق عبادت یعنی نماز کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

اس لئے جب بھی لفظ حدیث بغیر قرینہ کے بیان ہو تو اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول یا فعل مراد ہوگا۔ چنانچہ عربی لغت المنجد میں لکھا ہے کہ علم الحدیث عند المسلمین، ھو علم تحرث بہ اقوال النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) وافعالہ واحوالہ (المنجد زیر لفظ حدیث)

مسلمانوں کے نزدیک علم حدیث سے مراد وہ علم ہے جس کے ذریعہ (حضرت) نبی (کریم صلے اللہ علیہ وسلم) کے اقوال۔ افعال اور احوال جانے جاتے ہیں (کا علم حاصل ہو)

انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا سے بھی لفظ حدیث کی اِس تحریف کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ اس میں لکھا ہے:

Hadith:

The name given to a compilation of the teachings and life of The prophet Mohammad (peace be on him) with which the Kor'an forms the supreme authority on matters connected with the Mohammadan religion and legislation. This enormous literature of traditions. Which was primarily meant for personal guidance and edification has coloured the whole method and fabric of muslim thought"

(Encyclopaedia Britannica Vol. 11. Page 64)

ترجمہ:۔ (حضرت) محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے اسوہ کا وہ مجموعہ جسے قرآن (کریم) کے ساتھ مل کر مذہب اسلام اور اسلامی قوانین سے متعلق معاملات میں اعلیٰ ترین اختیار (احکام) کی حیثیت حاصل ہے۔ روایات کے اس کثیر ادبی مواد نے جس سے ابتداً انفرادی ہدایت و اصلاح مقصود تھی۔ بعدازاں اسلامی خیالات کے تمام اطوار کو متاثر کیا۔

ایک اور مشہور مستشرق (Gibb) اپنی تصنیف انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں لفظ حدیث کی یوں وضاحت کرتا ہے۔

Hadith.

Tradition. The word "Hadith" means primarily in general whether religious of profane then it has a particular meanings of a record of action or saying of The prophet and his Companians in the latter sense the whole body of the sacred tridition of the Mohammadans is called "The Hadith" and its science "Ilmal Hadith"

(Encyclopaedia of Islam
Gibb Page 116)

ترجمہ۔ بنیادی طور پر لفظ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی بات یا کہانی (قصہ) خواہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی لیکن اصطلاحی طور پر اس کے یہ معنی ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے افعال و اقوال۔ آخری معنوں کے اعتبار سے تمام مسلمانوں کی بیان کردہ روایات کو "حدیث" اور اس کے علم کو "علم الحدیث" کہا جاتا ہے۔

معمولی سے اختلاف کے ساتھ گب نے بھی انہی معنوں کو بیان کیا ہے۔ جن پر جمہور مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ "گب" کا صحابہؓ کے اقوال و افعال کو بھی حدیث کا حصہ قرار دینا اس کے مفہوم کی وسعت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہے۔ اس تمام بحث سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ مسلم اور غیر مسلم محققین کا اتفاق ہے کہ حدیث سے مراد حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا فعل یا تقریر ہی ہے۔ بعض محدثین علماء کے نزدیک صحابہ کے اقوال و آثار پر بھی حدیث کا لفظ وسعت معانی کی وجہ سے اطلاق پاتا ہے۔ تاہم امتیاز کرنے کے لئے علما نے ان کی تین اقسام بیان کی ہیں۔ مرفوع جس میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہو۔ موقوف۔ جس میں کسی صحابیؓ کا قول ہو۔ مقطوع۔ جس میں کسی تابعی کا قول ہو۔

تعلیمات و احکام اسلام کی بنیاد جن مسلمات پر ہے۔ ان کے ماخذ تین ہیں۔ (۱) قرآن حکیم (۲) سنت نبوی (۳) احادیث النبی

ان کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دین کی عمارت ان سب کے ملنے سے ہی مکمل ہوتی ہے۔ جس طرح ایک عمارت کی تعمیر کے لئے مختلف اجزا کی ضرورت ہوتی ہے جن میں سے ہر جزو اپنی جگہ نہایت اہم ہوتا ہے اسی طرح قرآن و حدیث و سنت کی مثال ہے۔ اگر قرآن کریم پر ایمان لانا اس کے منجانب اللہ ہونے اور احکام شرعیہ کا منبع ہونے کی وجہ سے فرض ہے تو سنت نبویہ پر عمل اور اس کی پیروی اس لئے ضروری ہے کہ یہ قرآن کریم کی عملی تصویر ہے۔ جو احکام قرآنیہ کی توضیح و تشریح کرتی ہے۔ جس کا علم ہمیں احادیث صحیحہ سے ملتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے نے مسلمانوں کو قیام صلوٰۃ کا فرمان دیا ہے۔ لیکن طریق ادائے صلوٰۃ قرآن کریم میں کہیں مذکور نہیں بلکہ حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل پیرا ہو کر مسلمانوں کو اس فریضۂ خداوندی کے ادا کرنے کا طریق سکھایا۔ جو ہم تک سنت متواترہ اور احادیث کے ذریعہ پہنچا۔

یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ قرآن کریم کے ساتھ سنت و حدیث بھی قرآن کی اساس ہیں۔ اگر قرآن کو روح سے اور سنت و حدیث کو جسم سے تشبیہ دی جائے تو یہ امر زیادہ واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح زندہ رہنے کے لئے روح اور جسم ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ اور جسم بغیر روح کے مردہ اور روح بغیر جسم کے بے کار ہوگی۔ اسی طرح قرآن کے وجود کے لئے سنت و حدیث مستلزم ہے۔ بعد و ملت دیگر

صرف قرآن کریم کو قابل عمل قرار دینا اور سنت و حدیث کو ترک کرنا دین کے ساتھ مستخر کرنے کے مترادف ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جو لوگ دور حاضرہ کے زہریلے مادی اثرات کا شکار ہو گئے ہیں مذہب انہیں ایک بار گراں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے آثار پھینکنے کے لئے وہ مختلف حیلے تلاش کرتے ہیں تاکہ شہوات نفسانیہ اور سفلی خواہشات کی تکمیل میں جو مذہبی قیود سد راہ ثابت ہوتی ہیں۔ انہیں دور کیا جا سکے۔ چنانچہ انہوں نے دیندار کہلاتے ہوئے اس سے گلو خلاصی کرانے کا یہ حل تلاش کیا۔ کہ احادیث نبویہ کو سرے سے ناقابل عمل اور مشکوک و مشتبہ قرار دے دو۔ کیونکہ انہی کے ذریعہ سے احکام دینیہ کی وضاحت ہوتی ہے۔ اور صرف قرآن کو حل دین اور قابل عمل ٹھہرا کر کافی حد تک مذہبی قیود سے آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ جب انسان صراط مستقیم سے بھٹک جاتا ہے۔ تو ضلالت و گمراہی کی تاریکی اسے صحیح راہ سے بہت دور پھینک دیتی ہے تب شیطان اس پر اپنا تسلط جما لیتا ہے، اور ایسے لوگ اپنے شیطانی افعال و اوہام کو بہت اچھا خیال کرنے لگتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

الذین ضل سعیہم
فی الحیوۃ الدنیا وہم
یحسبون انہم یحسنون
صنعا۔ (سورہ کہف آیت ۱۰۵)
وہ لوگ جن کی دنیوی زندگی میں کوشش

رائیگاں گئی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔

حالانکہ اگر قرآن کریم کے احکام و فرمودات کی تعمیل ہی کو فرض سمجھا جائے۔ تو یہ ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ہر قول و فعل کی حتی الوسع اطاعت کی جائے۔ متعدد آیات قرآنیہ سے ایک مسلمان کے لئے اسوۂ نبی کی اطاعت سے فرض ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ جن میں سے طوالت کے ڈر سے صرف چند ایک ذیل میں نقل کی جاتی ہیں۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ
اسوۃ حسنۃ لمن کان
یرجو اللہ والیوم الآخر
واذکر اللہ کثیرا

(سورۂ احزاب آیت ۲۱)

(اے مسلمانو) تمہارے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم (کی حیات طیبہ) میں (زندگی کا) بہترین اور کامل نمونہ ہے۔ (لیکن یہ اسی کے لئے ہے) جو اللہ اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہے۔ اور خدا کو کثرت سے یاد کرتا ہے۔

۲- یا ایہا الذین آمنوا
اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول
واولی الامر منکم۔ فان
تنازعتم فی شی فردوہ
الی اللہ والی الرسول ان

ان کنتم تومنون باللہ والیوم
الآخر (نساء آیت ۷)
اے مومنو اللہ کی اطاعت کرو۔ اور
رسول کی اور اپنے (فرمانرواؤں) کی بھی
پس اگر تم میں کسی امر میں اختلاف
ہو جائے تو اگر تم اللہ اور یوم آخرت
پر ایمان رکھتے ہو۔ تو اسے اللہ اور
اس کے رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کی
طرف لوٹا دو (اور ان کے حکم کی روشنی
میں معاملہ طے کرو)

۳۔ ومن یطع اللہ ورسولہ
یخش اللہ ویتقہ فاولئک
ھم الفائزون (نور آیت ۵۲)
اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی
اطاعت کریں اور اللہ سے ڈریں اور اس
کا تقوے اختیار کریں تو وہ بامراد
ہو جاتے ہیں۔

۴۔ واقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ
واطیعوا الرسول لعلکم
ترحمون۔ (نور ۵۷)
اور تم (سب) نمازوں کو قائم کرو اور
زکوٰۃ ادا کرو۔ اور اس رسول (صلے اللہ
علیہ وسلم) کی اطاعت کرو۔ تاکہ تم پر
رحم کیا جائے۔

۵۔ ومن یعص اللہ ورسولہ و
یتعد حدودہ یدخلہ
نارا خالدا فیھا ولہ عذاب
مھین (نساء ۱۵)
اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول
(صلے اللہ علیہ وسلم) کی نافرمانی کرے۔
اور اس کی حدود سے تجاوز کرے۔ تو وہ
(اللہ) اسے آگ میں داخل کرے گا جس
میں وہ ایک لمبے عرصہ تک رہتا چلا جائیگا
اور اس کے لئے رسوا کرنے والا عذاب
مقدر ہے۔

۶۔ یوم تقلب وجوھھم فی
النار یقولون یلیتنا
اطعنا اللہ واطعنا الرسول
(سورہ احزاب آیت ۶۷)
جس دن ان کو آگ پر الٹا یا پلٹایا جائیگا
تو وہ کہیں گے اے کاش ہم اللہ اور
اس کے رسول کی اطاعت کر لیتے۔

آیاتِ بالا سے عیاں ہے کہ جہاں اللہ تعالےٰ
نے اطاعت رسول کو فرض قرار دے کر اس کے
بدلہ میں گوناگوں انعامات و برکات سے نوازنے کا وعدہ
فرمایا ہے وہاں خبردار بھی کر دیا ہے کہ اگر تم نے اس
رسول کی نافرمانی کی تو اس کی عبرتناک سزا تمہیں
تمہیں دی جائے گی۔ اور یوم الحساب کو جب بسا قدمت
ایدیھم کے تحت ان کو جہنم میں جھونکا جائے گا تو
تو کف افسوس ملیں گے کہ کاش وہ بھی رسول کے اطاعت گزار

میں سے ہوتے۔

پس حصولِ قربِ الٰہی کے لیئے اطاعت اور متابعت رسول شرط اولین ہے کہ سمعنا و اطعنا کہتے ہوئے اس کے پیچھے ہولیں۔ جو اس وقت تک ممکن نہیں جب تک حضور علیہ السلام کے ارشادات و فرمودات اور اعمال و افعال سے مکمل آگاہی نہ ہو۔ موجودہ دور میں ان کی واقفیت کا واحد ذریعہ احادیث صحیحہ ہی ہیں۔

خود حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ شدید احساس تھا کہ آپ کے اقوال و افعال کی پیروی سے مسلمان شریعت پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ اس لئے آپ صحابہ کو اس بات کی تلقین فرماتے کہ جس طرح مجھے عمل کرتے دیکھو تم بھی اس کے مطابق عمل کیا کرو۔ مثلاً نماز کے بارہ میں فرمایا:

صلوا کما رایتمونی اصلی (بخاری)

یعنی میری طرح نماز پڑھا کرو۔

مناسک حج کے متعلق فرمایا:

خذوا عنی مناسککم (مسلم کتاب الحج)

کہ تم حج کے طریق اور مناسک مجھ سے سیکھو۔

اسی طرح فرمایا:

من اعرض عن سنتی فلیس منی (مشکوٰۃ)

کہ جس نے میری سنت سے اعراض کیا اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق واسطہ نہیں۔

صرف یہی نہیں کہ آپ نے صحابہ کو متابعت کا ارشاد فرمایا بلکہ یہ بھی تاکید کی کہ میری باتوں کو دوسروں تک پہنچاتے رہو۔ تاکہ وہ بھی ان پر عمل کر سکیں۔ اور ان کو یاد رکھ سکیں۔ تا آئندہ نسلیں ان سے آگاہ ہو سکیں لیکن ساتھ ہی ان کو تلبیس و تغلیط سے محفوظ رکھنے کے لئے جھوٹی حدیث بیان کرنے والے کے لئے عذاب جہنم کی وعید بھی بیان فرما دی۔

حجۃ الوداع کے موقعہ پر جو عظیم الشان تاریخی خطبہ آپ نے ارشاد فرمایا اس کے آخر میں فرمایا:

فلیبلغ الشاھد الغائب فان الشاھد عسی ان یبلغ من ادعی لہ منہ۔

(جامع البخاری کتاب العلم)

جو حاضر ہے اسے چاہیئے کہ غیب کو میری بات پہنچا دے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ سننے والا حاضر شخص کی نسبت زیادہ بات کو یاد رکھنے والا ہو۔

اسی طرح ایک اور حدیث یوں بیان فرمائی ہے کہ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نضر اللہ امرا سمع مقالتی فوعاھا واداھا کما سمعھا۔

(الاربعین للنووی)

حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ اس شخص کو سرسبز کرے جس نے میری بات سنی۔ پھر اسے یاد رکھا اور اس کے بعد ویسے ہی جیسے سنا تھا دوسرے

لوگوں تک پہنچا دیا

کسی غلط بات کو آپ کی طرف منسوب کرنے والے کے لئے آپ نے وعید بیان فرمائی کہ

عن ابن عباس قال قال رسول الله
صلی الله علیه وسلم اتقوا الحدیث
عنی الا ما علمتم فمن کذب علی متعمداً
فلیتبوأ مقعده من النار (ترمذی)

ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری احادیث بیان کرنے میں احتیاط کیا کرو۔ اور مجھ سے صرف وہی حدیث بیان کرو جس کو تم خوب جانتے ہو۔ جو شخص عمداً میری طرف جھوٹی بات منسوب کرے گا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے گا

ان حقائق اور شواہد کی بناء پر یہ کہنا بالکل صحیح اور بجا ہے کہ علم حدیث اور اس کی اشاعت کے ساتھ بہت سی برکات وابستہ ہیں اور اس علم کو دیگر علوم پر فوقیت حاصل ہے۔ مبارک ہیں وہ جو اس کی ضرورت واہمیت اور فوقیت وفضیلت کو سمجھتے ہوئے اس کی تحصیل وتبلیغ میں کوشاں ہیں اور اس قول کے مصداق ہیں ۔

اھل الحدیث ھم اھل النبی وان
لم یصحبوا نفسه انفاسه صحبوا

مبشر ناصر سال دوم

حُسن

- بہترین حسن عمدہ اخلاق میں ہے۔ (آنحضرت صلعم)
- مرد کا حسن اچھی زبان میں ہے۔ "
- حسن جمال ہوتا ہے سراہا جاتا ہے (گوئٹے)
- حسن ایک جال ہے جس سے قدرت عقلوں کا شکار کرتی ہے۔ (ہیگس)
- عورت کا اپنے حسن پر غرور اس کی طرف سے اقرار ہے کہ اس کے پاس حسن کے سوا کوئی چیز قابلِ فخر نہیں۔ (مارموذیل)
- ارسطو سے کسی نے پوچھا کہ حسن کیا ہے اس نے جواب دیا کہ یہ سوال اندھوں سے کرنا چاہیئے۔ (رسکن)
- حسن بہت کم عمر چیز ہے۔ (ڈیکنس)
- اس یقین سے زیادہ عورت کے لئے کسی بات کا یقین مشکل نہیں کہ وہ اپنے حسن سے محروم ہو گئی ہے۔ (روشر آڈن)
- عورت اپنے محبوب سے جدائی گوارا کر سکتی ہے۔ مگر اپنے حسن سے نہیں۔ (روشبران)

کرامت علی ایم۔ اے

اردو اور چار تہذیبیں

"پاکستان کی بھی ایک مخصوص زبان ہے جس میں اس کی تمام ذہنی معاشرتی اور تمدنی قدریں جلوہ گر ہیں۔ یہ ایک ایسی زبان ہے جس میں بیشمار علمی ادبی اور ثقافتی دھارے بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فارسی، عربی، ہندی اور انگریزی ایسی عدیم المثال زبانیں ہیں جو زبان کی آبیاری کر رہی ہیں۔ یہ ایک ایسی دلہن ہے جس نے قسم قسم کے زیورات سے اپنے حسن کی تزئین کی ہے! ایران کے لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں اور باغوں کے سدابہار پھولوں نے اس کی سہرا بندی کی ہے۔ عرب کی زمین کا خمیر اس کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ مغل شہنشاہوں نے اسے ملکہ حسن بنانے کے لئے ہیرے جواہرات' اور آبدار موتیوں سے اس کی مانگ میں سیندور بھرا ہے۔ ہندی کے شیریں اور حلاوت آمیز الفاظ نے اس کے ہونٹوں کو زینت بخشی ہے۔ انگریزی کے اعلیٰ علمی سرمائے نے اس کے ذہن و دماغ کی تربیت کی ہے۔ غرضیکہ چار زبانوں کی مختلف "تہذیبوں" نے اس پر خاصہ اثر کیا ہے۔ یہی وہ زبان ہے جسے "لشکری زبان" اور اردوئے معلیٰ کے خطابات مل چکے ہیں۔"

(اقتباس)

مرسلہ۔ شجاع الحق

شعروں کا انتخاب

لایا ہوں میں خود دل کو، ہتھیلی پہ سجا کر
اِس جنس کے بازار میں کیا دام ہیں بولو

(رشید قیصرانی)

غرور و ناز سے میرے خطوں کو پھینکنے والو
کبھی تعویذ سمجھو گے ان اوراقِ پریشاں کو

(ثاقب زیروی)

مجھ سے مانگو نہ تم ثبوتِ جنوں
میرے دامن میں کوئی تار نہیں

(علامہ لطیف انور)

پہلے بڑی رغبت تھی تیرے نام سے مجھ کو
اب سن کے ترا نام میں کچھ سوچ رہا ہوں

(عبدالحمید عدم)

شہزاد کے قلم سے۔

طلبا کی سرگرمیاں

۰ بزمِ اُردو ——

تعطیلاتِ موسم گرما کے بعد جلد ہی بزمِ اردو کا الیکشن ہوا۔ اس دفعہ ڈگری میں کوئی اردو اعلیٰ کا طالبِ علم نہیں تھا اس لیے سالِ دوم سے ہی صدر اور معتمد کا انتخاب عمل میں آیا۔ عباس علی ہاشم بڑی بھاری اکثریت سے منتخب ہوئے۔ معتمد کے عہدہ کے لئے شجاع الحق کو منتخب کیا گیا۔ بزمِ اردو کے تحت اکتوبر کے دوسرے ہفتہ میں دوسری کل پاکستان اردو کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔

دو روزہ کانفرنس کے ۸ اجلاس ہوئے۔ کانفرنس میں ملک کے مختلف اطراف سے آئے تین سو ادیبوں، صحافیوں، شعراء اور تعلیمی اداروں کے سربراہوں نے شرکت کی۔ کانفرنس میں ساٹھ افراد نے ادب، مذہب، سائنس، صحافت اور محسنینِ اردو پر مقالے پڑھے۔ آخر میں مشاعرہ ہوا جس کی صدارت سید عابد علی عابد نے کی۔ مشاعرہ میں شرکت کرنے والوں میں طفیل ہوشیارپوری، خرتی بن شائق، ڈاکٹر نصیر آغا خان، عبدالرشید تبسم، ریاض مجید، سلیم بے تاب، عبدالسلام اختر، ثاقب زیروی، روشن دین تنویر، انور حیدرآبادی، ناظر ہاشمی، علامہ لطیف انور، رشید قیصرانی، سجاد باقر رضوی اور مقبول قریشی شامل تھے۔

اردو کانفرنس کا افتتاح ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی نے کیا۔

کانفرنس میں ڈاکٹر ظفر علی ہاشمی وائس چانسلر زرعی یونیورسٹی لائل پور، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر سید وقار عظیم اور ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی شرکت کی اور مختلف اجلاسوں کی صدارت کی

اردو کانفرنس کی خبریں اخبارات نے جلی سرخیوں سے شائع کیں اور علم دوست طبقہ نے اردو کانفرنس پر اظہارِ مسرت کیا۔

بزمِ اردو کے تحت یومِ پطرس منایا گیا۔ اسی طرح رشید قیصرانی کے ساتھ ایک شام منائی گئی۔ اس بزم کے تحت کئی مشاعروں اور تنقیدی نشستوں کا اہتمام کیا گیا

۰ سٹوڈنٹس یونین ——

انتخاب — سٹوڈنٹس یونین کے سالِ نو کے عہدیداران کا انتخاب ۲۸ ستمبر ۶۶ء کو کالج ہال میں ہوا۔ صدارت کے عہدہ کے لئے دو امیدوار تھے اور یہی دونوں

امیدوار گذشتہ سال سکرٹری کے عہدہ کے لئے بھی انتخابات میں حصہ لے چکے تھے۔ گزشتہ برس محمد نواز نے سمیع طاہر کے مقابلے میں انتخاب جیتا تھا لیکن عجیب بات ہے کہ اس دفعہ صدارت کا عہدہ سمیع طاہر نے صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے حاصل کرلیا۔ درج ذیل یونین کے دیگر عہدہ دار منتخب ہوئے۔

سیکرٹری — وسیم احمد سال سوم

جائنٹ " — شاہد ریاض سال دوم

اسسٹنٹ " — رفیق اختر رفیقی سال اول

ان کے علاوہ یونین کے درج ذیل مقررین حضرات کیبنٹ میں نامزد ہوئے۔

نعیم عثمان	مبارک سیف
سرور مقصود	سفیر الحق
بصیر حسن	مجید احمد طاہر
طاہر عارف	شجاع الحق

افتتاح:۔ سٹوڈنٹس یونین کا افتتاح ۱۲ اکتوبر ۶۷ء کو کالج ہال میں جناب محترم قاضی محمد اسلم صاحب پرنسپل تعلیم الاسلام کالج ربوہ نے کیا۔

مباحثات کا آغاز:۔ سال رواں کا سب سے پہلا اردو مباحثہ ۴ نومبر کو کالج ہال میں منعقد ہوا۔ قرارداد زیر بحث تھی۔ اس ایوان کی رائے میں

"شاعری بے کاروں کا مشغلہ ہے"

ایوان نے قرارداد کثرت رائے سے مسترد کردی۔ منصفین نے اول انعام کا حقدار کسی مقرر کو قرار نہیں دیا۔ نتیجہ درج ذیل رہا۔

دوم — شجاع الحق سال دوم

سوم — وسیم احمد سال سوم

حوصلہ افزائی کا انعام۔ ارشد محبوب سال دوم

سٹوڈنٹس یونین کا دوسرا مباحثہ ۱۸ نومبر کو انعقاد پذیر ہوا قرارداد زیر بحث تھی ایس ایوان کی رائے میں

"موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں"

ایوان نے قرارداد مسترد کردی منصفین نے متفقہ فیصلے سے پھر اول کسی مقرر کو نہیں دیا نتیجہ یہ رہا۔

دوم — عبدالمجید طاہر سال سوم

سوم — مبارک سیف سال سوم

حوصلہ افزائی — سفیر الحق " "

یونین کا تیسرا مباحثہ ۲۸ نومبر کو ہی ہوا۔ یہ مباحثہ انگریزی کا تھا۔ قرارداد زیر بحث تھی

In the opinion of this House :-

"Fortune always favours fools"

اس مباحثہ میں نعیم عثمان کو پہلا انعام دیا گیا۔ ایوان نے کثرت رائے سے قرارداد مسترد کردی۔

سٹوڈنٹس یونین کے تحت چوتھا مباحثہ ۳۰ جنوری ۶۸ء کو ہوا۔ یہ ایک آل ربوہ اردو مباحثہ تھا۔ قرارداد زیر بحث تھی اس ایوان کی رائے میں

"آج ایشیا کو جمہوریت کی نہیں آمریت کی ضرورت ہے"

قرارداد ایوان نے کثرت رائے سے مسترد کر دی۔ منصفین کے فیصلے کے مطابق درج ذیل نتیجہ تھا۔

اول انعام ۔ عبدالمجید طاہر تعلیم الاسلام کالج ربوہ
دوسرا انعام ۔ شجاع الحق " "
تیسرا انعام ۔ سفیر الحق " "
حوصلہ افزائی کا انعام ۔ لئیق احمد عابد " ہائی سکول ربوہ

سٹوڈنٹس یونین کے تحت پانچواں مباحثہ ۱۷ فروری ۶۸ء کو منعقد ہوا۔ یہ ایک پنجابی مباحثہ تھا۔ قرارداد زیر بحث تھی۔ الیس پیار دی لوڑ ج

"جناب اسے نال نہیں جذبے نال جتی جاندی اے"

ایوان نے کثرت رائے سے قرارداد منظور کر لی۔ نتیجہ درج ذیل ہے:

انعام اول ۔ عبدالمجید طاہر سال سوم
دوسرا انعام ۔ نعیم عثمان سال چہارم
تیسرا انعام ۔ ارشد محبوب سال دوم
حوصلہ افزائی کا انعام ۔ سفیر الحق سال سوم

○ ہالینڈ میں تبلیغ اسلام —

سٹوڈنٹس یونین کے تحت جناب حافظ قدرت اللہ صاحب سابق مبلغ ہالینڈ نے طلباء سے ہالینڈ میں تبلیغ اسلام کے موضوع پر ۱۵ فروری ۶۸ء کو خطاب فرمایا۔

○ سالانہ مباحثات —

سٹوڈنٹس یونین کے تحت آل پاکستان بین الکلیاتی مباحثات کالج ہال میں ۱۵، ۱۶ مارچ کو منعقد ہوئے۔

انگریزی مباحثہ میں نعیم عثمان نے قائد ایوان اور قائد حزب اختلاف کے فرائض ۔ سرور مقصود زیدی نے ادا کئے۔ اردو مباحثہ میں مجید طاہر قائد ایوان اور ظہیر الحق قائد حزب اختلاف تھے۔

انگریزی مباحثہ ۱۵ مارچ کو رات ۸ بجے کالج ہال میں انعقاد پذیر ہوا۔ قرارداد زیر بحث تھی

In the opinion of this House:-

"Right is Might"

ایوان نے کثرت رائے سے قرارداد مسترد کر دی۔ منصفین کے متفقہ فیصلے کے مطابق گورنمنٹ کالج لاہور کے عمران اسلم کو اول اور ظفر نذیر کو دوسرا انعام دیا گیا تیسرا اور حوصلہ افزائی کا انعام مرے کالج سیالکوٹ کے شاہد راشدی اور صفدر حسین کو دیا گیا۔ ٹرافی گورنمنٹ کالج لاہور کو دی گئی۔

اردو مباحثہ ۱۶ مارچ رات آٹھ بجے کالج ہال میں انعقاد پذیر ہوا۔ قرارداد زیر بحث تھی: اس ایوان کی رائے میں

"اعلیٰ تعلیم سے ذہنی انتشار پیدا ہوتا ہے"

ایوان نے یہ قرارداد بھی مسترد کر دی۔ منصفین کے متفقہ فیصلے کے مطابق لاء کالج لاہور کے صاحبزادہ جمیل لطیف نے پہلا انعام حاصل کیا۔ دوسرا انعام مرے کالج سیالکوٹ کے صفدر حسین کو ملا تیسرا انعام ظفر اقبال گورنمنٹ کالج جہلم نے حاصل کیا۔ حوصلہ افزائی

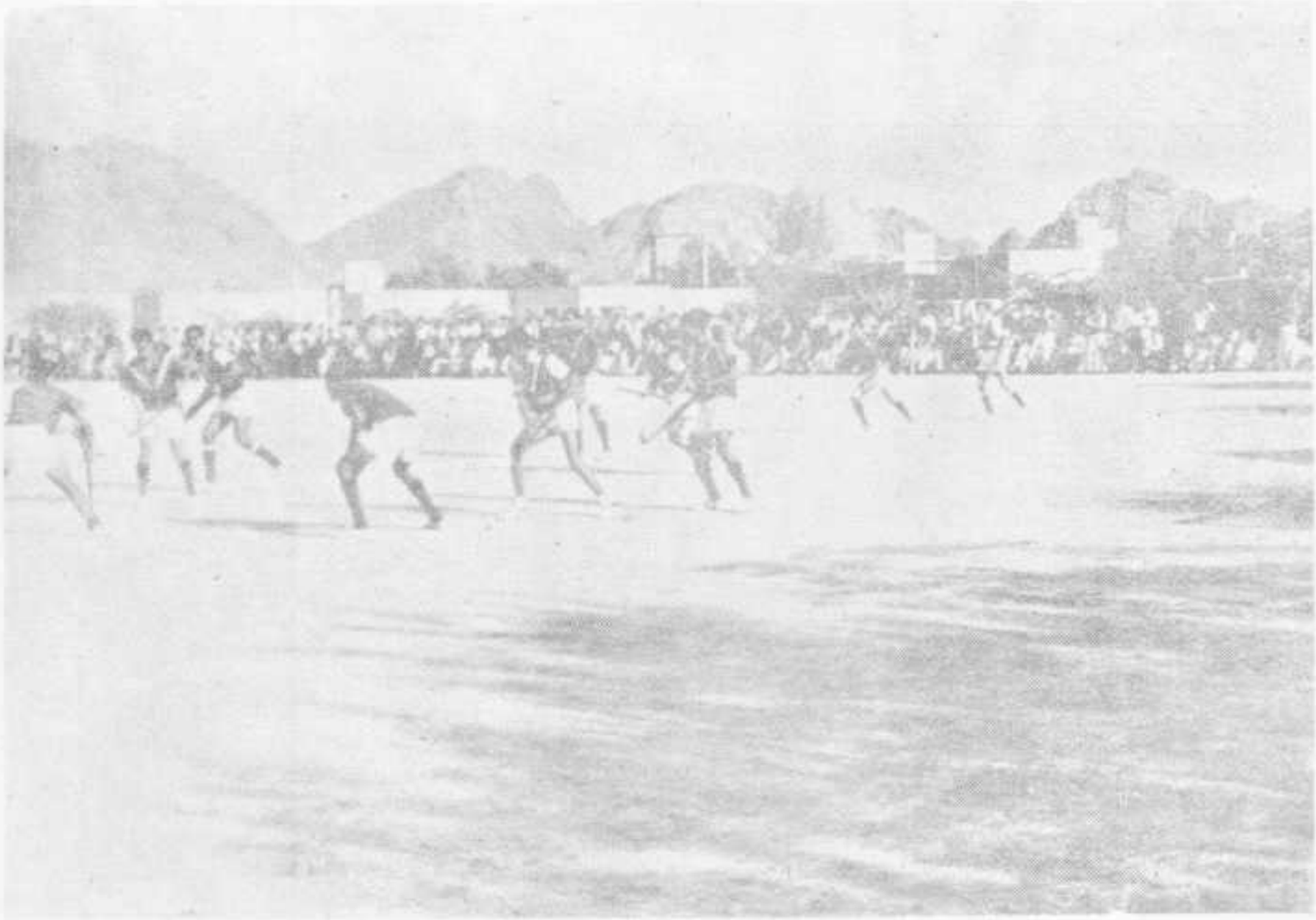

ہاکی ٹیم میدان عمل میں

انٹرذونل ہاکی یونیورسٹی ٹورنامنٹ کے میچ سے قبل مہمان ٹیم (گورنمنٹ کالج سرگودھا) کا تعارف پروفیسر چوہدری محمد علی صاحب ایم۔اے سے کروایا جارہا ہے۔

تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی ڈگری ہاکی ٹیم اپنے
انچارج پروفیسر عبدالرشید غنی کے ہمراہ

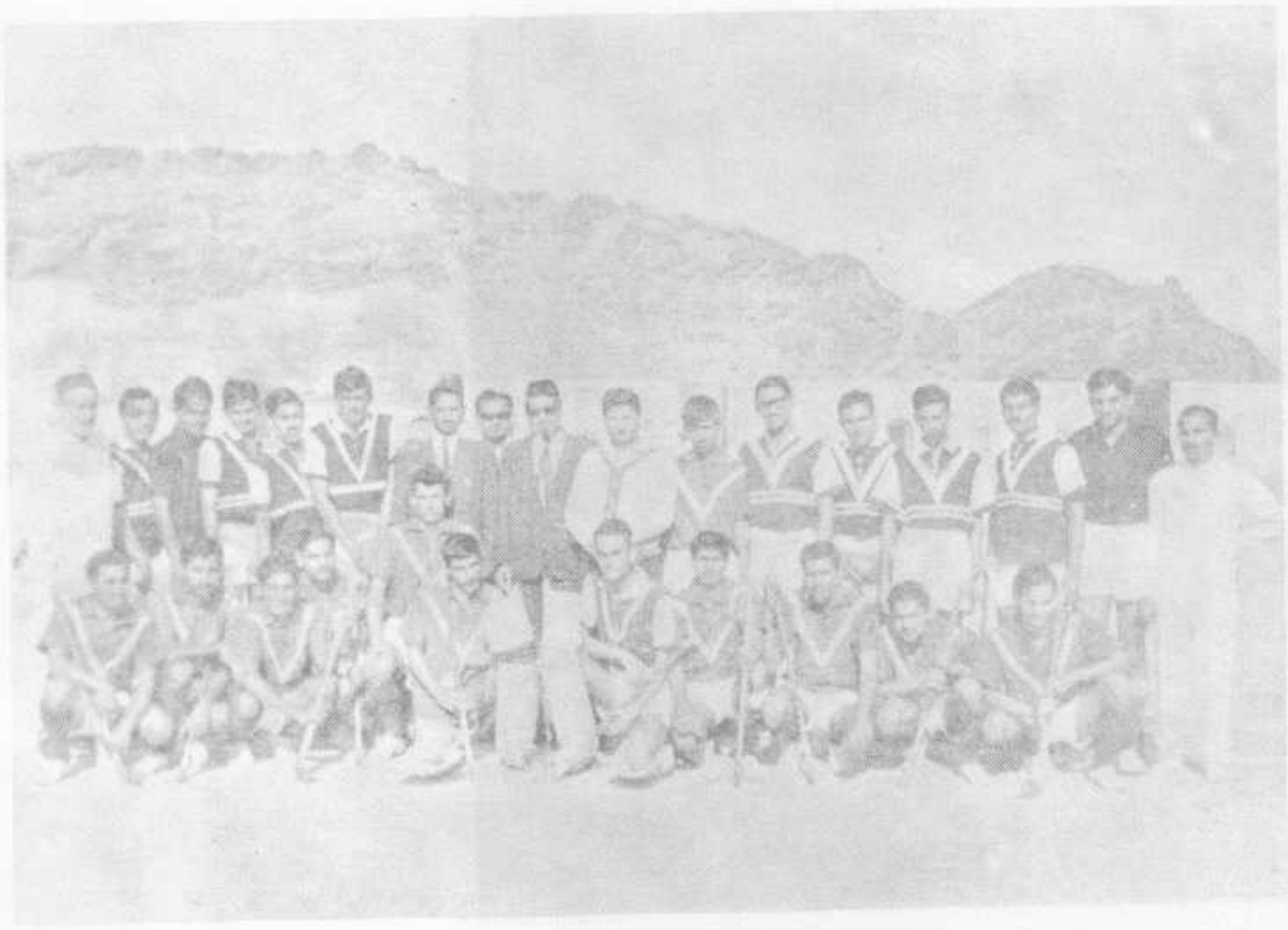

تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی ڈگری ہاکی ٹیم مہمان ٹیم گورنمنٹ کالج سرگودھا کے ساتھ

کا انعام گورنمنٹ کالج سرگودھا کے فرید احمد نے حاصل کیا۔ تیسرا انعام گورنمنٹ کالج جہلم نے حاصل کی

انگریزی مباحثہ میں منصفی کے فرائض جناب پروفیسر چوہدری محمد علی صاحب ایم۔ اے جناب سید محمود شاہ صاحب سابق پرنسپل دارالاسلام کالج مشرقی افریقہ اور جناب پروفیسر ر۔ ا۔ ظہیر گورنمنٹ کالج ٹوبہ ٹیک سنگھ نے سرانجام دیئے۔ منصف اعلیٰ پروفیسر چوہدری محمد علی صاحب ایم۔ اے تھے۔

اردو مباحثہ میں منصفی کے سرانجام جناب مولانا شیخ مبارک احمد صاحب رئیس التبلیغ مشرقی افریقہ جناب مولانا حافظ قدرت اللہ صاحب سابق مبلغ ہالینڈ اور جناب تا لبشیر صاحب ایڈووکیٹ لائل پور نے ادا کیے۔ منصف اعلیٰ جناب مولانا شیخ مبارک احمد صاحب تھے۔

٥ بزم ریاضی

بزم ریاضی کا انتخاب ۷ اکتوبر ۱۹۰۰ کو عمل میں آیا۔ پروفیسر چوہدری حمید اللہ صاحب اس کی صدارت میں ہیں۔ نائب صدر راجہ صابر حسین اور سیکرٹری حمید الدین عنبر منتخب ہوئے۔ بزم ریاضی کے تحت مختلف اجلاس ہوئے جس میں مختلف طلبہ اور اساتذہ نے مقالے پڑھے

٥ بزم معاشیات

بزم معاشیات کا انتخاب اکتوبر ۱۹۰۰ کے آخری ہفتہ میں ہوا۔ عبدالستار نائب صدر اور تنویر احمد سیکرٹری منتخب ہوئے۔ اس سوسائٹی نے کوشاں رہ کر اپنا اور اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ لیکن اساتذہ معاشیات کے تیزی سے بدلتے رہے۔ یونین اور بزم اردو کے بعد سب سے زیادہ فعال سوسائٹی دہلے ہوتی تھی لیکن اس سال اب تک کوئی کام نہیں کیا۔

٥ بزم فارسی

فارسی پڑھنے والوں نے اپنی ایک انجمن بنائی ہے۔ جس کے نائب صدر سید شفیق ہیں۔ یہ بزم ایران جانے کے بارے میں ایک پروگرام تشکیل دے رہی ہے۔

٥ مجلس ارشاد

اس مجلس کے اجلاس میں سارے کالج کے طلبہ شریک ہوتے رہے۔ اس کے صدر نصرت باجوہ اور مہتمم مبارک سیف ہیں۔ یہ مجلس بڑے بڑے علماء کی کالج میں تقاریر کا انتظام کرتی ہے۔ اس سال اس مجلس کے تحت مولانا ابوالعطاء صاحب جالندھری، مولانا عبدالرحمٰن صاحب بنگالی اور صوفی بشارت الرحمٰن صاحب نے بالترتیب قرآن کی اہمیت، امریکہ میں تبلیغ اسلام اور قرآن، نماز کی اہمیت پر طلباء سے خطاب فرمایا۔

٥ مجلس عربی

عربی پڑھنے والے طلباء کی یہ مجلس عربی پڑھنے اور دوسرے طلباء میں عربی پڑھنے کا شوق پیدا کرنے کے لیے مجلس قائم کی گئی ہے۔ اس مجلس کے تحت کالج کے طلباء کے درمیان حسن قراءت کا مقابلہ کرایا گیا

اس کے علاوہ ایک آل ربوہ مقابلہ حسن قرات کا انعقاد بھی عمل میں آیا۔ اس مجلس کے تحت مولانا شیخ نور احمد صاحب منیر. مولانا غلام باری صاحب سیف نے طلبہ سے خطاب فرمایا۔ اس مجلس کے صدر منیر الحق ثاقب اور مبارک احمد سیف ہیں۔

○ سائنس سوسائٹی —

اس سوسائٹی کے تحت طلبہ اور اساتذہ مختلف موضوعات پر مقالہ جات پڑھتے ہیں۔ اس کے صدر بشیر احمد اور سیکرٹری محمد امین ہیں۔

○ فوٹو گرافک کلب —

کالج نے اس سال فوٹو گرافک کلب کا اجراء سازو سامان سے کیا ہے۔ کالج کی مختلف تقاریب کی فوٹو اب اسی کلب سے تیار ہوتی ہیں۔ کلب کے صدر سلیم اکبر اور سیکرٹری احسن الحق ہیں

○ شماریات سوسائٹی —

اس سوسائٹی کے تحت مختلف معلومات کے حصول کے لئے طلباء کا ایک گروپ لاہور کے تاریخی مقامات کی سیاحت کے لئے گیا۔ اس سوسائٹی کے نائب صدر راشد منصور اور سیکرٹری شاہد نواب ہیں۔

قاصد کے پاؤں توڑے بدگمانی نے مری
خط تو دیا مگر نہ بتلایا نشانِ کوئے دوست
اے جلائے جان سے آتش دیکھئے کیونکر بنے
دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

اقوالِ زرّیں

۱۔ دنیا عاقل کی موت پر اور جاہل کی زندگی پر ہمیشہ آنسو بہاتی ہے۔ (افلاطون)

۲۔ سات سمندروں کے پانی کے مقابلے میں انسان کی آنکھوں سے کہیں زیادہ آنسو بہہ چکے ہیں۔ (گوتم بدھ)

۳۔ اگر چڑیاں متحد ہو جائیں تو شیر کی کھال کھینچ سکتی ہیں۔ (شیخ سعدی)

۴۔ اتحاد و اتفاق دنیا کو تسخیر کرنے والی قوتیں ہیں۔ (ابن اہیلس خراسانی)

۵۔ محتاط لوگ عموماً کم غلطیاں کرتے ہیں۔ (کنفیوشس)

۶۔ شکستہ کشتیوں کو ساحل کے قریب ہی رہنا چاہیئے (فرینکلن)

۷۔ دوسروں کی بدقسمتی سے احتیاط کا درس لو۔ (سائرس)

۸۔ بغیر دیکھے کوئی چیز منہ میں نہ ڈالو اور بغیر پڑھے کبھی دستخط نہ کرو۔ (اسپینی کہاوت)

(مرسلہ۔ شجاع الحق سال دوم)

حافظ عباس علی عاصم ۔ سال دوم ۔ ایف ۔ اے

سودا کی شاعری اور اُس کا فن

مرزا محمد رفیع سودا اردو شاعری میں ایک ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ آپ کی پیدائش ۱۱۱۹ھ یا ۱۱۲۵ھ کے لگ بھگ ہوئی۔ مولانا محمد حسین صاحب آزاد آپ کی پیدائش کا سن ۱۱۲۵ھ بتاتے ہیں۔ آپ کے والد کا نام مرزا محمد شفیع تھا جو تجارت کے سلسلہ میں ہندوستان آئے۔ اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ تجارت کی بدولت آپ کو کافی شہرت اور دولت نصیب ہوئی۔ اور آپ جلدی ہی فارغ البال ہو گئے۔ آپ کی شادی نعمت خاں عالی کی دختر نیک اختر سے ہوئی اور سودا انہی کے بطن سے پیدا ہوئے۔

سودا کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی آپ کے والد نے اپنی وفات کے وقت بہت کچھ چھوڑا۔ اگر سودا چاہتے تو بڑی آسانی سے اوسط درجہ کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ لیکن سودا کی طبیعت نے یہ بات قبول نہ کی۔ اور باپ کی دولت کو چند دنوں میں اڑا دیا اور بعد ازاں فوج میں ملازم ہو گئے لیکن طبیعت یہاں جم نہ سکی۔ اور آخر کار آپ کو فوج سے دستبردار ہونا پڑا۔ سودا کا خاندان قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا

چنانچہ سودا اپنے خاندانی اعزاز اور کچھ خدا داد صلاحیتوں کے طفیل جلد ہی امراء اور بادشاہوں کے مقرب بن گئے۔

شاعری میں اصلاح :۔ سودا سب سے پہلے اپنا کلام قلی خاں ودود کو دکھاتے رہے۔ بعد ازاں شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے تلمذ کیا۔ سودا نے اگرچہ فارسی میں بہت کچھ کہا ہے اور بڑے بڑے استادوں سے داد بھی حاصل کی ہے لیکن یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جو شہرت آپ کو اردو کی بدولت نصیب ہوئی۔ فارسی اس کا عشر عشیر بھی نہ دلوا سکی

سودا کو اردو میں شعر کہنے کا مشورہ :۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:۔

"پہلے سودا فارسی میں شعر کہا کرتے تھے۔ خان آرزو نے کہا کہ مرزا فارسی اب تمہاری مادری زبان نہیں۔ اس میں ایسے بے نظیر ہو سکتے کہ تمہارا کلام اہل زبان کے مقابل میں قابل تعریف ہو۔ طبع موزوں ہے۔ شعر سے نہایت مناسبت رکھتی ہے۔ تم اردو کہا کرو تو یکتائے

زمانہ ہو گئے۔"

سودا کو دلی سے بہت انس تھا۔ اور دلی سے باہر جانا انہیں بہت شاق تھا لیکن اب ایسا وقت بھی آیا کہ انہیں دلی کو خیرباد کہنا پڑا۔ ستر سال کی عمر فرخ آباد میں نواب بنگش کے ہاں ٹھہرے۔ کچھ مدت فیض آباد میں شجاع الدولہ کے دربار کے ساتھ منسلک رہے اور آخری حصہ لکھنؤ کی سرزمین میں بسر ہوا۔ ستر برس کی عمر میں ۱۱۹۵ھ میں آپ نے وفات پائی اور اس طرح اردو زبان اپنے ایک شاعر عظیم سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئی۔

شاہ حاتم جو کہ سودا کے استاد تھے اور جنہیں سودا پر بہت ناز تھا۔ وفات کی خبر سن کر بے تاب ہو گئے اور ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا "افسوس ہمارا پہلوان سخن مر گیا۔"

سودا کو قدرت نے ایک دل و دماغ دے رکھا تھا کہ اردو کے بہت کم شاعروں کو یہ نعمتِ عظمیٰ ملی ہوگی۔

قصیدہ، ہجو اور شہر آشوب: سودا کو قریباً ہر صنف سخن پر قدرت حاصل تھی اور انہوں نے اکثر اصناف سخن پر نہایت کامیابی سے طبع آزمائی کی ہے قصائد اور ہجو میں وہ نام پیدا کیا کہ کوئی شاعر ان کی گرد کو بھی نہ پا سکے گا۔

آزاد لکھتے ہیں:

"سودا کا ایک غلام تھا جس کا نام غنچہ تھا جو سودا کے ساتھ ہر وقت قلمدان اٹھائے پھرتا تھا جب کسی سے بگڑ جاتے تو فوراً پکارتے ارے غنچہ لاؤ قلمدان ذرا اس کی خبر لوں۔ یہ مجھے سمجھا کیا ہے۔ پھر شرم کی آنکھیں بند اور بے حیائی کا منہ کھول کر وہ بے نقط سناتے کہ شیطان بھی امان مانگے۔"

سودا کے ہم عصر سودا سے دبتے تھے اور کسی میں یہ ہمت نہ تھی کہ وہ سودا سے الجھ سکے۔ قیام الدین قائم جو کہ چاند پور کے رہنے والے تھے اور فن شاعری میں کمال رکھتے تھے گو سودا کے شاگرد بھی رہے۔ ایک مرتبہ سودا کے کسی شعر پر معترض ہوئے۔ سودا نے ان کی لمبی چوڑی ہجو کہہ ڈالی۔ جب قائم کو علم ہوا تو بہت گھبرائے اور آ کر اپنی خطا معاف کرائی۔ چنانچہ سودا نے ان کا نام نکال کر ایک فرضی نام "فوقی" لکھ دیا۔

سودا کو لوگوں کی ہجو کہنے کا جنون تو تھا ہی۔ ایک دن ایک ولایتی کی جو کہ ایک معزز عہدے پر فائز تھا ہجو کہہ ڈالی اور پھر ایک بھری محفل میں اس کے سامنے ہی پڑھنی شروع کر دی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ جب ہجو ختم ہو چکی۔ تو وہ اٹھ کر سامنے آ گیا اور سودا کی کمر کا پٹکا پکڑ کر مسلسل متواتر گالیاں دینے لگ پڑا۔ سودا کو اس قسم کے حادثہ سے دوچار ہونا پڑا اس سے قبل کبھی اتفاق نہ ہوا تھا سخت گھبرا گئے اور کہنے لگے۔ جناب آغا صاحب اس قسم کی باتیں آپ کے شایان شان نہیں ہیں۔

ولایتی نے پیش قبض کمر سے کھینچ کر ان کے پیٹ پر رکھ دی اور کہنے لگا حضرت! ابھی بھی تعلیم کیا تھی اس کی نثر مجھ سے سن لیجئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم نے اپنا مافی الضمیر شعروں میں ادا کیا ہے۔ لیکن مجھے شعر کہنے نہیں آتے اس لئے نثر میں ادا کر رہا ہوں
(آبِ حیات ص ۱۶۹)

قصیدہ کو وہی شاعر اپنا سکتا ہے جو فطرتاً زندہ دل خوش طبع اور درباری اصولوں سے واقف ہو اور یہ تمام باتیں سودا میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ سودا کے علاوہ اگرچہ میر نے بھی قصیدہ پر طبع آزمائی کی ہے لیکن مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ جو رنگ سودا نے اپنے قصیدوں میں پیدا کیا ہے میر کی وہاں تک رسائی نہیں ہو سکی۔ میر کے لئے قصیدہ نگاری میں جو چیز رکاوٹ تھی۔ وہ تلخی حیات اور یاس و قنوطیت کی دیوار تھی لیکن سودا اس کے برعکس خوش اور رنگین مزاج قسم کی شخصیت کے مالک تھے اور یہی وجہ ہے کہ سودا سخن کی اصناف میں میر سے سبقت لے گئے ہیں۔

ممتاز الحق صاحب (ایم۔ اے۔ رتلیگ) لکھتے ہیں:

"سودا کے متعلق ہم عصر تذکرہ نگاروں نے تعریف کی ہے۔ وہ نہایت نیک اخلاق و دیانت دار اور مرنجاں مرنج انسان تھے ان کا برتاؤ ہر مذہب اور طبقہ کے لوگوں کے ساتھ یکساں تھا۔ دوسرے لوگ بھی ان کے حسن سلوک، ان کی ذہانت و ظرافت اور ان کے کمالات کی وجہ سے ان کی بے حد قدر کرتے تھے۔"

آزاد لکھتے ہیں:

"ان کے دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا ان کی یہ خوبی بچپن سے موت تک قائم رہی۔ چنانچہ بڑھاپے میں بھی طفلانہ شوخی نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔"

سودا کے قصائد کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ زمین مشکل منتخب کرتے ہیں لیکن نشست الفاظ سے دلآویز بنا لیتے ہیں۔

۲۔ قصیدے کی شان کو پوری طرح قائم رکھتے ہیں۔ یعنی متانت، پختگی، زورِ الفاظ، مضمون آفرینی، علوِ تخیل جتنا ان کے قصائد میں ہے وہ کسی اور کے یہاں نہیں ملتا۔

۳۔ تلمیحات اور تشبیہات کے استعمال میں جدت و ندرت سے کام لیتے ہیں۔

۴۔ سودا کے قصائد میں مدح و ہجو کے علاوہ تاریخی واقعات بھی ہیں۔

سودا نے قصیدہ نگاری کے علاوہ شہر آشوب کے میدان میں بھی اپنی جولانی طبع کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ ان کی مثال دوسرے شعراء میں نہیں ملتی۔ سودا کا وہ مخمس ملاحظہ ہو جو آپ نے بے روزگاری کی تضحیک میں لکھا۔

کیا یہ آج ہی سودا سے کیوں تجھ ڈانواں ڈول
پھرے ہے جا بجا بھی نوکر ہو لے سے کے گھوڑا مول
لگا کہنے یہ اس کے جواب میں وہ بول
تجھے میں کیوں لگا سمجھے گا تو کہ ہے یہ مشغول
بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیریوں یا تول

سودا کے متعلق ایک انگریز کا قول ملاحظہ ہو:-

"جس طرح رومۃ الکبریٰ کے زوال کی تصویر دیکھنے کے واسطے ہر دنیا دن روما کا مشہور ہنجر نگار مصنف مرقع نگاروں کی صفحہ گردانی کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم کو زوال دولت مغلیہ کی سچی تصویر دیکھنی ہے تو ہم کو چاہیئے کہ سودا کی ان پُر آشوب نظموں کا مطالعہ کریں جس میں انہوں نے مرہٹہ سواروں کی عین قلعہ دہلی کی دیواروں کے نیچے قتل و غارت گری کا سچا فوٹو اتارا ہے۔"

(تاریخ قصائد اردو مؤلفہ سید جلال الدین جعفری)

شہر آشوب کا طوفان تو جلد ہی ختم ہو گیا لیکن ہجویات کا بحر بیکراں نہ تھم سکا۔ جس شخص سے ساتھ بھی سودا کی ذرا ان بن ہوئی سودا نے اس کی پگڑی اچھالنے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا۔ جب دہلی میں تھے تو میر اور ناظم کے ساتھ ٹھنی رہی اور جب لکھنؤ پہنچے تو میر ضاحک کو آڑے ہاتھوں لیا اور ان کی خوب گت بنائی۔ فرخ آباد کے زمانہ قیام کے دوران فدوی لاہوری کے ساتھ جھڑپ ہو گئی۔ غرض معمولی سا اختلاف ہوا اور سودا نے باوا آدم تک تمام پشتیں کھنگال کر رکھ دیں۔ جی بھر کر مغلظات سنائیں اور دل کھول کر گالیاں دیں۔ سودا نے اپنے ایک ہم عصر مولوی صاحب کو محض اس لئے اپنا مشقِ ہجو بنایا کہ وہ یزید بن معاویہ کو اولی الامر کہتا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی بزرگی اور تقدس پہ کسے شک ہو سکتا ہے لیکن آپ بھی سودا کے عتاب سے نہ بچ سکے۔

حافظ جلال الدین صاحب جعفری سودا کے متعلق رقمطراز ہیں:

"ان کی ہجو کو اگرچہ یاوہ گوئی کہا جا سکتا ہے۔ مگر بقول مترجم "تاریخ ادب" ہمارے واسطے وہ ایک زعفران زار چھوڑ گئے ہیں جو ابدالآباد تک شاداب و سرسبز رہے گا۔ ان کی ہجو گوئی میں وہ گرمیٔ کلام اور تیزی ہے جس سے وہ ظرافت و مذاق کا ایک دائمی ذخیرہ بن گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس صنف سے ان کو فطری مناسبت بلکہ قدرتی خصوصیت تھی"

سودا کا یہی کمال ہے۔ انہوں نے اپنی ہجو میں ظرافت کا ایسا رنگ بھر دیا ہے جس نے شاعری کی اس صنف کو بھی دوسری اصناف کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا ہے۔ اور ہم اب بلا جھجک اردو زبان کی اس صنف کو بھی غیر زبانوں کے مقابلہ میں رکھ سکتے ہیں۔

سودا خود تو دوسروں کی ہجو کہتے ہی تھے لیکن جب کوئی اور

ان کی جو کہتا تو خوش ہو کر اسے داد دیتے۔ سودا کا یہ شگفتہ مزاج آخر وقت تک قائم رہا۔

ثناء الحق صاحب لکھتے ہیں :-

"حق یہ ہے کہ ان (سودا) کی زبان سے جو کچھ نکلتا باعث اس کا یا فقط شوخی طبع یا وقتی جوشِ ناراضی کا ہوتا تھا۔ اور مادہ کثافت فقط اتنا ہوتا کہ جب الفاظ کا منہ پر آجاتے تو دل صاف ہو جاتا"

سوداکا رنگِ تغزل :- غزل میں ان کا خاص رنگ یہ ہے کہ کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریباں ہے۔ جیسے آگ کے شعلے میں گرمی و روشنی۔ سودا اپنے اشعار میں الفاظ کی نشست و برخاست کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ اگر ایک لفظ بھی ادھر سے ادھر کر دیا جائے تو سارا شعر بے مزا اور کرکرا ہو کے رہ جاتا ہے۔ الفاظ کی بندش اور حسنِ ترتیب سودا کی شاعری کا خاصہ ہے۔ معنویت اور درد و الم کے علاوہ سودا کی غزلوں میں تاثیر کی چاشنی بھی موجود ہے۔ نیز جا بجا تشبیہات اور استعارات کے استعمال سے ایک خاص لطف پیدا کر لیتے ہیں۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ زبان نہایت میٹھی، طرزِ تکلم نہایت سادہ لیکن پُر کشش۔ الفاظ کی ترتیب نہایت احسن اور تاثیر کا یہ عالم ہے کہ ہر شعر پڑھتے ہی دل میں اتر جائے فرماتے ہیں

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

کیا ضد ہے میرے ساتھ خدا جانئے ورنہ
کافی ہے تسلی کو مرے ایک نظر بھی

کس ہستیٔ موہوم پہ نازاں ہے تو اے یار
کچھ اپنے شب و روز کی ہے تجھ کو خبر بھی

تنہا ترے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش
رہتا ہے سدا چاک گریبانِ سحر بھی

اور اسی غزل کا مقطع ہے ؎

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

سودا نے اردو شاعری پر ایک احسان بھی کیا کہ ثقیل ہندی الفاظ کو نکال کر اردو کو ایک تو قابلِ فہم بنایا۔ دوسرے ان الفاظ کے بدل پیش کئے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ سودا نے ہندی اور فارسی محاورات کے ترجمے نہایت خوش اسلوبی سے اردو میں منظم کئے ہیں۔ ایک مثال پیش کرتا ہوں :-

بو کردن سے بو کرنا یعنی سونگھنا

دیکھوں نہ کبھی گل کو ترے منہ کے میں ہوتے
سنبل کے سوا زلف تری بو نہ کروں میں

بو کردن سے بو کرنا جس خوش اسلوبی سے سودا نے نظم کیا ہے اس سے سودا کی اس صلاحیت کا آسانی سے اندازہ ہو جاتا ہے۔ جو قدرت نے انہیں صرف اردو شاعری کے لئے ودیعت کی تھی اب میں سودا کے چند اشعار آپ کے سامنے پیش کرتا

ہوں جن سے سودا کی شاعری کو سمجھنے میں مدد مل
سکے گی۔ سودا دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری کا
نقشہ اپنے الفاظ میں یوں کھینچتے ہیں ؎

اس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب چشم کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا

اور پھر فرماتے ہیں ؎

خندۂ گل بے نمک فریاد بلبل بے اثر
اس چمن سے کہہ تو جا کر کیا کرینگے یاد ہم

جب انسان کے دل پر حسرت و یاس کے مہیب بادل
چھا جاتے ہیں اس وقت کی حالت کا نقشہ سودا نے
یوں کھینچا ہے ؎

نے بلبل چمن نہ گل نو دمیدہ ہوں
میں موسم بہار میں شاخ بریدہ ہوں
گریاں بہ شکل شیشہ و خندہ بطرز جام
اس میکدے کے بیچ عبث آفریدہ ہوں

مزید ارشاد ہوتا ہے ؎

ہیں دردِ دل سے موت ہو یا دل کو تاب ہو
قسمت کا جو لکھا ہے الٰہی شتاب ہو
اس کشمکش سے دام کی کیا کام تھا ہمیں
اے الفتِ چمن ترا خانہ خراب ہو

کسی کا دل توڑنا معیوب ہی نہیں بلکہ گناہ
بھی ہے لیکن سودا اسے کس خوبصورتی سے
کعبہ پر فوقیت بخشتے ہیں ؎

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ
کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائیگا

عاشق میں جفا سہنے کا جذبہ ہوتا ہے اور معشوق
میں ظلم و ستم کرنے کا۔ اس لئے فطرت عاشق کے
دل میں اضطراری کیفیت کا پیدا ہونا ایک
لازمی امر ہے۔ سودا اس اضطراری کیفیت کو
یوں بیان کرتے ہیں ؎

ترا دل مجھ سے نہیں ملتا مرا جی رہ نہیں سکتا
غرض ایسی مصیبت ہے کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا

جب محبوب ظلم کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اسے
اس کے ظلم و ستم کا احساس یوں دلاتے ہیں ؎

قاتل ہمارے نعش کی تشہیر ہے ضرور
آئندہ تا کوئی نہ کسی سے وفا کرے

عاشق کے دل کی صحیح تعریف صرف سودا ہی
کر سکتے ہیں ؎

آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا
کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا

بے شک حسن دلفریب بھی ہے اور دلپذیر بھی۔
لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر چیز ہر شخص کے لئے
اتنی ہی حسین ہو جتنی کہ وہ دوسرے کے لئے حسین
ہوتی ہے۔ سودا اپنے محبوب کے متعلق ارشاد
فرماتے ہیں ؎

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس حال میں دیکھا

مجنوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

سمجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

ناصح اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے دوسرے شعرا کی طرح سودا کے پاس بھی آتا ہے۔ اور عشق سے باز رہنے کی وعظ و نصیحت کرتا ہے۔ سودا اس کے احترام اور وقار کا بھی خیال رکھتے ہیں لیکن دو ٹوک بات بھی کہہ جاتے ہیں :-

تیرے سخن کو میں بسر و چشم ناصحا
اڑتا ہزار بار اگر دل سے بس چلے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر خدا کا دیکھنے جاتے ہیں لیکن سودا کہتا ہے کہ خدا تو ہر جگہ موجود ہے۔ پھر کوہِ طور پر جانے کی کیا ضرورت ہے :-

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا
موسیٰ نہیں کہ سیر کروں کوہِ طور کا

ہر شاعر کے ہاں بہار و جام کا مضمون تو آپ کو ملے گا لیکن جس طرح سودا اس مضمون کو باندھتے ہیں، شاید ہی یہ مضمون کسی اور نے اس طرح باندھا ہو :-

ساقی گئی بہار رہی دل میں یہ ہوس
تو منتوں سے جام دے اور میں کہوں کہ بس

اور سودا کا یہ شعر تو کسی تعریف و تشریح کا محتاج نہیں ہے۔ اس کے متعلق صرف اتنا لکھ دینا ہی کافی ہے کہ سودا کو خود یہ شعر بہت پسند تھا :-

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

آزاد اس شعر کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :-

"استاد مرحوم (ذوق) کہا کرتے تھے کہ جب سودا کے سامنے کوئی یہ شعر پڑھ دیتا یا اپنی ہی زبان پر آ جاتا تو وجد کیا کرتے تھے اور مزے لیتے تھے" (آبِ حیات)

ایہام۔ سودا کے دور میں ایہام والے شعر زیادہ پسند کئے جاتے تھے۔ سودا نے بھی ابتدا میں اپنے اشعار میں ایہام پیدا کرنے کی کوشش کی مگر جب طبیعت نہ جم سکی۔ تو یہ کہہ کر دستبردار ہو گئے :-

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی
منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

مرثیہ : مرثیہ کے میدان میں بھی سودا اپنی جدت طرازی کا ثبوت دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ آپ سے قبل مرثیہ کی شکل غزل یا ایسی ہی ایک دو شکلوں تک قائم تھی۔ مگر آپ نے اسے مربع، مخمس، مسدس اور مستزاد وغیرہ تمام شکلوں میں پیش کیا۔

تلامذۂ سودا : سودا اس بارے میں کافی خوش قسمت واقع ہوئے ہیں کہ ان کے شاگرد

میر کی نسبت کہیں زیادہ تھے۔

سودا ایک بہترین نقاد بھی تھے۔ تنقید کے موضوع پر ان کی دو تصنیفات ملتی ہیں۔ ایک عبرت الغافلین اور دوسری سبیل ہدایت ہے۔ عبرت الغافلین فارسی زبان میں ہے۔ اور سودا کے نظریۂ تنقید کی وضاحت کرتی ہے۔ سودا کے کلیات میں قریباً ہر قسم کے اصنافِ سخن اور مضمون کے رنگا رنگ شامل ہیں۔ مثلاً غزلیات، واسوخت، مناظرِ قدرت، اخلاقیات۔ قصائد، مثنویات، سلام و مراثی۔ اعتراضات، سبیل ہدایت۔ ہجو شہر آشوب ہے اور اس کے علاوہ فارسی کی عمدہ غزلیں بھی مل سکتی ہیں۔

سودا کے متعلق نواب محمد مصطفٰے خان شیفتہ کی رائے بھی ملاحظہ فرمایئے۔ شیفتہ اپنے تذکرہ "گلشن بے خار" میں لکھتے ہیں:۔

"(سودا) ایک بلند پایہ شاعر اور مکمل استاد تھے۔ فنونِ شاعری میں سب سے آگے تھے۔ ان کے کلام میں حلاوت و چاشنی ہوتی ہے اور جدت تو ان کا خاص حصہ ہے۔ ان کے کلام کی مثال ایسے آفتاب کی ہے جس میں گہن نہیں لگتا۔ ان کے مضامین عالی اور خیالات بلند ہوتے ہیں۔ ان کو تمام اصنافِ شاعری پر پوری قدرت حاصل ہے ...... ان کی غزل قصیدہ سے بہتر ہوتی ہے اور قصیدہ غزل سے بہتر ہوتا ہے۔ مثنوی اچھی نہیں کہتے۔ ذلیل قسم کی ہجویں بہت کہی ہیں۔ اور ان کا یہی طریقہ تھا۔ ان کے مضامین دلآویز ہوتے ہیں۔"

طارق کی دعا

(اندلس کے میدانِ جنگ میں)

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

○

دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

(اقبال)

(مرسلہ وحید احمد سال اول)

منیر الحق شاہد ایم۔اے عربی

اندلس میں علوم وفنون کی ترقی

اندلس براعظم یورپ کا وہ انتہائی وسیع وعریض ملک ہے جسے اگر یونانیوں نے آئیبیریا کا نام دیا تو رومانیوں نے ہسپانیہ کے لقب سے پکارا۔ جب کلمہ گو وہاں پہنچے تو انہوں نے اس کو اندلس کے نام سے موسوم کیا۔ خیال ہے کہ یہ نام حضرت نوح علیہ السلام کے شجرہ نسب سے اندلس بن طوبال بن یافث سے مشتق کیا گیا ہے۔ گو یہ خیال کچھ زیادہ قابل یقین نہیں۔

یہ علاقہ اپنی معروف حدود میں جزیرہ نما کی شکل رکھتا ہے۔ ایک طرف پہاڑوں کا سلسلہ ہے اور باقی تین طرف نیلگوں سمندر کی لہریں اس کے ساحلوں سے ٹکرا کر اپنی زندگی کو ختم کرتی ہیں۔ آج اسپین اور پرتگال الگ الگ ہیں لیکن جب مسلمان اس سرسبز علاقہ میں پہنچے تو یہ سب ایک ہی علاقہ تھا۔

یورپ کا یہ حسین ملک، قدرتی نعمتوں اور جملہ رعنائیوں سے آراستہ ہے۔ یہاں زمین زرخیز کرنے والی ندیاں بھی بہتی ہیں اور حسین مگر تیز رو آبشار بھی۔ معدنیات سے پُر پہاڑوں کے سلسلے بھی ہیں اور ہرے بھرے مرغزار بھی۔ گو عربوں نے اسے جزیرہ کا نام دیا مگر شکلاً جزیرہ نما ہے جیسے کہ جزیرہ نما عرب ہے۔

عرب اس علاقے میں ۵ رجب سنہ ۹۲ھ بمطابق ۹ جولائی سنہ ۷۱۱ء میں داخل ہوئے۔ سب سے پہلا حملہ جنوبی حصہ پر ہوا۔ جو اندلیشیہ کہلاتا تھا۔ لہذا فتح کے بعد اُسے اندلس کے نام سے پکارا گیا۔ مگر جب قدم بڑھتے گئے۔ اور فتوحات کا سلسلہ طویل ہوتا گیا تو کل علاقہ کو ہی "اندلس" کا نام دیا گیا۔

وسطی یورپ کی تاریخ میں اسپین کی مسلم حکومت کا دور ذہنی ترقی کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مسلمانان اندلس نے شاید ہی کوئی شعبۂ حیات ایسا چھوڑا ہو جس میں انہوں نے قابل ذکر ترقی نہ کی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری صدی ہجری سے چوتھی صدی تک اگر اسپین کے مسلمانوں نے علوم وفنون کی ترقی میں حصہ نہ لیا ہوتا تو یورپ نشأۃ ثانیہ سے قطعاً محروم رہتا۔

اس بات پر سب متفق ہیں کہ شاہانِ اُمویہ کی سرپرستی میں علوم وفنون نے انتہائی ترقی کی۔ دراصل یہ لوگ صحیح معنوں میں شعراء، ادباء، علماء فضلاء اور حکماء کے مربّی بنے۔ ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرکے اُن کی صحیح قدر دانی کی۔ نہ صرف اپنے دربار سے منسلک رکھ کر بلکہ اپنے قائم کردہ دار العلوم میں اعلیٰ عہدوں پر فائز کرکے خود بھی تمام علوم نقلی ومعنوی اور فنونِ لطیفہ سے استفادہ کیا۔ اور عوام الناس کو بھی اُن سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ بہم پہنچایا۔ انہی میں سے بعض بادشاہ

زرِ کثیر خرچ کر کے اور اپنی اعانت و سرپرستی کا یقین دلا کر دُور دُور کے ممتاز مشاہیر فن و ادب کو جمع کیا اور اندلس کو گہوارۂ علم و فن بنا دیا۔

تعلیمی ترقی کا آغاز اس امر سے کیا کہ رومی اور یونانی ادب کی بے شمار کتب کو مترجمین کے ذریعہ عربی میں منتقل کرایا تعلیم کو عام کرنے کے لئے ابتدائی مفت تعلیم کا وسیع انتظام کیا۔ چنانچہ پورے علاقے میں جابجا ایسے مکتب قائم کروا دیئے جن میں تکمیل تعلیم اور عملی تحقیقات کی جملہ سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ قرطبہ جو دارالخلافہ تھا سرچشمۂ علم اور مستقر علماء ہی بن گیا۔ جتنی ترقی یہاں ہوئی کہیں نہیں ہوئی یورپ کے تمام ممالک سے طلباء تحصیل علم کی خاطر یہاں آتے اور ذوق و شوق کی تکمیل کرتے۔

جامع قرطبہ کا پروفیسر القالی اور اس کا شاگرد محمد بن الحسن زبیدی اس عہد کے علمائے ادب میں ارفع مقام رکھتے تھے۔ مسعودی تاریخ نویسی میں۔ ادریسی جغرافیہ دانی میں اور ابن الرشد فلاسفر کی حیثیت سے ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ اندلس نے سینکڑوں ایسے ایسے فرزند پیدا کئے اور انہیں پروان چڑھایا جو آسمانِ علم و فن میں ستاروں کی طرح چمکے۔ علمی ترقی کا یہ وہ دور تھا جبکہ یورپ ابھی جاہل تھا۔

ابتدائی تعلیم زیادہ تر قرآن مجید، صرف و نحو اور فنِ شعر تک محدود ہوتی تھی۔ اونچے درجے کی تعلیم میں دینیات۔ تاریخ۔ لغت۔ فنِ شعر۔ فلسفہ۔ جغرافیہ اور علم کیمیا وغیرہ شامل تھے۔ اس تعلیم کے لئے متعدد یونیورسٹیاں قائم تھیں جن میں جامعہ قرطبہ اور غرناطہ بہت مشہور تھیں جامعہ قرطبہ میں ہیئت۔ ریاضی اور طب کی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔ مقریزی کے بیان کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عورتوں کو بھی تعلیم کی آزادی حاصل تھی۔ یونیورسٹیوں کے ساتھ بڑی بڑی عظیم الشان لائبریریاں قائم تھیں جن میں سے قرطبہ کی شاہی لائبریری خاص شہرت رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ کتب بینی کا شوق اس قدر تھا کہ گھر گھر ایک لائبریری قائم تھی۔ کتب کی دکانیں بکثرت پائی جاتی تھیں۔

اہلِ یورپ عربوں کو سرے سے مؤرخ تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ محض واقعہ نویس بتاتے ہیں لیکن ابن حیان کی تاریخ اندلس دیکھی جائے تو تاریخ نویسی کے کمال کی داد دینا پڑتی ہے۔ یہ تاریخ دو حصوں میں ہے۔ اور ایک حصے میں دس جلدیں ہیں۔ دوسرے میں سات جلدیں۔ اسی طرح ابن القوطیہ اندلس کا قدیم اور مشہور مؤرخ تھا۔ اس کی تصنیف "تاریخ فتح اندلس" بہت مشہور ہے۔ اسی عہد کے ایک مؤرخ ابوالحسن السالمی نے ایک کتاب "اخبار فتنۂ ثانیہ اندلس" لکھ کر اس ملک کے متعلق ایک قابلِ ذکر اور قابلِ اعتماد تاریخ کا اضافہ کیا۔

ابوعبید البکری اس دور کا مشہور جغرافیہ دان ہو گذرا ہے۔ مشہور کتاب "المسالک والممالک" اسی کی تصنیف ہے۔ اسی طرح احمد بن محمد الرازی نے اندلس کے شہروں کے متعلق ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں ٹیلوں، پہاڑوں دریاؤں شہروں سب کا مفصل ذکر کیا ہے۔ ہیئت و ریاضی میں ابوعبیدہ مسلم بن احمد المعروف بہ صاحب القبلہ عظیم شہرت کے مالک تھے۔ مشہور ریاضی دان ہونے کے علاوہ

علم نجوم میں بھی یکتا تھے۔ ستاروں اور سیاروں کی حرکت اور ان کے اثرات سے مکمل آگہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی علم حدیث وفقہہ میں بھی دسترس رکھتے تھے۔

ابن عبدالرحمٰن الرزقال اس دور کے انتہائی شہرت یافتہ مہندس تھے۔ آپ نے کئی قسم کی گھڑیاں تیار کیں۔ آلاتِ اسطرلاب سب سے پہلے آپ ہی نے ایجاد کیا۔ ابو القاسم (جنہوں نے پتھر سے شیشہ بنانے کی ترکیب معلوم کی تھی) نے ایک ایسا حسابی آلہ تیار کیا جسے مثقال نام دیا گیا۔ اس سے وقت کا تعین ہوتا تھا۔ انہوں نے پرندوں کو ہوا میں اڑتا دیکھکر خود بھی فضا میں اڑنے کی کوشش کی اور سب سے پہلے ایسے پَر ایجاد کئے جن کو باندھ کر یہ کچھ دور ہوا میں اُڑے۔ انہوں نے اپنے گھر میں ایک ایسی ہیئت بنائی ہوئی تھی جس پر ستارے ابر۔ بجلی۔ پانی۔ بارش طوفان سب کا پتہ چلتا تھا۔ اُن کو اُڑنے کی کوشش کرتے دیکھ کر بہت سے لوگ اُن کا مذاق اُڑاتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کی جانفشانیوں ہی کے نتیجہ میں آخر کار اہل یورپ نے ہوائی جہاز کے ذریعہ فضا میں اُڑنے کا فن سیکھا۔ اور موسم کی تبدیلی معلوم کرنے کے لئے آلہ تیار کیا جسے بیرومیٹر کا نام دیا جاتا ہے۔

آج یورپ طبّ اور سرجری کے میدان میں حیرت انگیز کارنامے سرانجام دے رہا ہے۔ لیکن اُس وقت اس فن میں مسلمانوں کو یدطولیٰ حاصل تھا۔ اور اندلس میں ان ہی کے ذریعہ طب وجراحی نے بڑی ترقی حاصل کی۔ ابن الرشد۔ ابن میمون۔ ابن باجہ اور ابن طفیل دنیا میں صرف فلاسفر کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ یہ سب اندلس کے عظیم اطباء میں سے تھے۔ اور طبابت ہی ان کا پیشہ تھا۔

الذہراوی الحکم ثانی کا درباری طبیب تھا۔ سرجری میں عربوں میں اس کا مثیل پیدا نہیں ہوا۔ اپریشن وجراحی کو دورِ حاضر کا کرشمہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس دور میں یہ فن اپنے کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ مستند مصنّف لیبان مسلمانوں کے اعلیٰ طبیب اور جرّاح ہونے کا اعتراف ان الفاظ میں ہے:۔

"فنّ جراحی کی ابتدائی ترقی بھی عربوں سے ہوئی۔ اس زمانے میں بھی ان کو آنکھوں کی سرجری جو سب سے زیادہ نازک مقام ہے آتی تھی۔ پتھری کو بغیر اپریشن نکال دیتے تھے۔ خون کو ٹھنڈے پانی سے بند کر دیتے تھے۔ زخموں کو کانٹ کر ریشمی ٹانکوں سے سی دیتے تھے۔ بے ہوشی کی دوا اپریشن سے پہلے سنگھانے کا رواج تھا۔"

علم فلسفہ کے بارے میں تو یورپین فلاسفر بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں بالخصوص اندلس کے مسلمانوں کا فلسفہ میں حصہ بہت زیادہ ہے۔ پہلا قدم تو اس کی اشاعت میں انہوں نے یہ اٹھایا کہ تمام فلسفۂ یونان کو عربی میں ترجمہ کر ڈالا۔ اور پھر اس صنف پر غور کر کے اپنے بیش بہا نظریات پیش کئے۔ اندلس میں سب سے پہلا اور مشہور فلاسفر ایک یہودی یحییٰ بن جبرول تھا۔ اُس نے "ینبوع الحیاۃ" نامی کتاب لکھ کر بہت شہرت حاصل کی۔

بارھویں صدی میں ابو بکر محمد بن یحییٰ المعروف بہ ابن باجہ نے فلسفہ کے میدان میں بہت شہرت پائی۔ اپنی کتاب "تدبیر المتوحد" میں آپ نے بتایا کہ ایک انسان عقل و ذہانت سے

کام ہے کہ کیونکر باب الوحیت تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن بعد کے مؤرخین نے اسے ملحد اور بے دین قرار دے دیا۔

ابن باجہ نے ہیئت میں بطلیموس کے بہت سے نظریوں میں ترمیم کی۔ پھر ایک اور مشہور فیلسوف ابن طفیل تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ اُن کا ایک فلسفیانہ رومان ہے۔ اُن کے دوست ابن رشد کے اعلیٰ پایہ فلسفیانہ نکات نے یورپ میں ادھم مچا دیا۔ ابن رشد کو یورپ میں "AVIROSS" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ فلسفہ میں آپ نے ایک کتاب "تھافۃ التھافۃ" تصنیف کی جو امام غزالی کی کتاب تھافۃ الفلاسفہ کا جواب ہے۔ فلسفہ و تصوف کے سرخیل ابن العربی بھی سرزمین اندلس کے ہی فرزند تھے۔ آپ کی تصنیف "الفتوحات المکیۃ" بہت مشہور تصنیف ہے۔

علوم کے علاوہ فنون میں ترقی بھی مسلمانوں کے ذریعہ انتہا کو پہنچ گئی۔ ایک شخص زریاب نے اندلس میں موسیقی کا آغاز کیا اور مروّجہ سازوں میں بعض تبدیلیاں بھی کیں۔ چنانچہ عود میں پانچویں تار کا اضافہ اسی نے کیا۔

کاغذ کے متعلق کہا تو جاتا ہے کہ اس کو چینیوں نے ایجاد کیا لیکن درحقیقت اس کی ایجاد کا سہرا بھی اندلس کے مسلمانوں کے سر ہی بندھتا ہے۔ کیونکہ کاغذ کو وہ شکل جس سے آج ہماری نگاہیں آشنا ہیں مسلمانوں نے ہی دی۔ چینی کے ظروف سب سے پہلے اندلس ہی کی سرزمین سے ایجاد ہو کر دور دور تک پھیلے۔ طلائی زیورات و سامان آرائش اور دھات کے برتنوں کی نقاشی اور مینا کاری و رنگ آمیزی اس طریق پر کی جاتی کہ نفاست اور حسن صناعی کے شاہکار معلوم ہوتے۔ پتھروں سے گھڑ کر مورتیاں و فوّارے نیز مختلف استعمال کی چیزیں اس عمدگی سے بناتے کہ عقل اس حسن و صناعی پر دنگ رہ جاتی۔

رنگ برنگ کے پتھروں کو گھڑ گھڑ کر نوک دار محرابیں۔ سبک اور منقش ستون۔ خوبصورت اور مزین دیواریں اور رنگین و دیدہ زیب فرش تعمیر کرتے جو مشرقی طرز کا نمایاں انداز تھا۔ الغرض دوسری سے چوتھی صدی ہجری تک یہاں سے علوم و فنون نے جو ترقی کی بالآخر یورپ نے اس سے وافر حصّہ لیا۔ اور آج وہ ان باتوں میں بہت آگے بڑھ چکا ہے۔

(بقیہ ص ۴)

ہو چکی ہے۔

اور یہ صاحب مجھے کیسے بھول سکتے ہیں جو ہمیشہ اس وقت میرے پاس آتے ہیں جبکہ انہیں کسی تقریر یا مباحثے میں حصہ لینا ہو اور آتے ہی ایک عدد تقریر کی فرمائش کر دیتے ہیں۔ اور مجھے اُن کی خاطر درجنوں کتابیں پڑھنی پڑتی ہیں۔

اور انہیں میں کیسے فراموش کر سکتا ہوں جو مجھے اکثر فوٹو گرافر کی دکان پر بیٹھے نظر آتے ہیں اور ہمیشہ اسی سوچ میں غلطاں ہوتے ہیں کہ اس دفعہ تصویر کے لئے کونسا "پوز" بہتر رہے گا۔

جب میں تنہائی میں کبھی ان حضرات کو یاد کرتا ہوں تو کسی شاعر کے ایک شعر کا یہ مصرعہ بے ساختہ میری زبان پر آ جاتا ہے ع

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

حافظ عباس علی عاصم ۔ سال دوم ایف اے

طنز و مزاح

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے؟

(اپنے دوستوں سے معذرت کے ساتھ)

یہ دوست بھی عجیب شئے ہوتے ہیں ۔ لوگ نہ جانے کیوں ان کے متعلق مبالغہ آمیز باتیں کرتے نہیں تھکتے۔ اگر انہیں میرے دوستوں سے سابقہ پڑ جاتا تو وہ بھی سجاد حیدر یلدرم کی طرح "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" کہتے ہوئے اس دنیائے فانی سے کوچ کر جاتے لیکن دوست احباب اُن کی خلاصی نہ کرتے بلکہ ایسے چمٹتے کہ اُن کی روحیں قبروں میں بھی آسودگی اور اطمینان کا سانس نہ لے سکتیں۔

میں اپنے دوستوں میں سے چند ایک کا تعارف کرواتا ہوں ۔ اگر بارِ خاطر نہ ہو تو اُن سے ملیئے ۔

——— یہ ہیں میرے ایک دوست ۔ فلاسفی کے طالب علم ہیں۔ شعر و شاعری سے انہیں کافی حد تک دلچسپی ہے۔ جب بھی ملتے ہیں یا تو فلسفے کے فوائد اور اس کی گہرائیوں پر ایک عدد لیکچر (جو کہ کئی گھنٹوں پر مشتمل ہوتا ہے) دیتے ہیں ۔ یا پھر آتے ہی میرا دامن پکڑ لیتے ہیں ۔ اور کم از کم چھتیس چھتیس شعروں پر مشتمل نظمیں سناتے ہیں ۔ جن میں اکثر اشعار اُلٹے سیدھے اور بے وزن ہوتے ہیں ۔ اور مجھے داد دینے پر خواہ مخواہ مجبور کرتے ہیں ۔ میں اُن سے بہت کتراتا ہوں ۔ اور اکثر ملنے سے گھبراتا ہوں لیکن یہ ہمیشہ میری تاک میں رہتے ہیں اور ملتے ہی اپنا کلام سنانا شروع کر دیتے ہیں ۔

ان سے ملیئے :— یہ صاحب جب بھی آتے ہیں چپکے سے آتے ہیں اور آتے ہی ایک عدد مکّا رسید کر دیتے ہیں ۔ یہ بات مجھے آجتک معلوم نہیں ہو سکی کہ انہیں مجھ سے کیا بَیر ہے اور یہ کس دشمنی کا بدلہ لے رہے ہیں جب میں اُن کی طرف غصّے سے دیکھتا ہوں تو یہ دانت نکالنا شروع کر دیتے ہیں ۔ اور مجھے خود اُن کی حماقت پر ہنسی آجاتی ہے ۔

اَب اِن سے ملیئے :— یہ صاحب عموماً اس وقت آتے ہیں جب میں کتابیں لیکر پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں ۔ آتے ہی بازار چلنے کی دھمکی دیتے ہیں ۔ اور میری کتابیں خود ہی بند کر کے میز پر رکھ دیتے ہیں۔ چائے کا ایک کپ پیش کرتے ہیں اور پھر دنیا بھر کے مسائل پر گفتگو کرتے چلے جاتے ہیں ۔ آخر میں ادب پر بھی بات چیت ہوتی ہے ۔ اور پھر مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آجکل تم کیا لکھ رہے ہو؟ بسا اوقات جی میں آتا ہے کہ اِن سے صاف کہہ دوں کہ تمہاری عقل کا مرثیہ لکھ رہا ہوں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا ہوں کہ آئندہ کہیں چائے کے اس کپ سے بھی ہاتھ دھونے نہ پڑ جائیں ۔

اَب اِن حضرت سے ملیئے :— یہ جب بھی آتے ہیں سبق پڑھانے کے متعلق فرماتے ہیں اور جب میں سبق پڑھانے لگتا ہوں تو یہ سیاست پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں

اور بعد میں کہتے ہیں کہ میں تو گھر سے پڑھنے آیا تھا لیکن تم نے مجھے باتوں ہی باتوں میں اُلجھا لیا۔

اور اَب اِن حضرت کو ملاحظہ کیجیئے:۔ یہ صاحب آجکل ایڈیٹر بننے کے سہانے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایک دن ہم نے ان سے پوچھا۔ کیوں بھئی ایڈیٹر بن کر کیا کرو گے کوئی اور معزز کام کیوں نہیں کر لیتے؟ تو یہ صاحب چہک کر کہنے لگے۔

"ہم ایڈیٹر بنیں گے۔ لوگ ہمارے پاس اپنے مضامین بھیجا کریں گے۔ اور ہم رعب سے کہا کرینگے کہ تمہارا مضمون اشاعت کے قابل نہیں ہے۔"

انہی حضرت سے کل ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے۔ بھئی کچھ ہمارے رسالے کے لئے بھی لکھا کرو۔ معاوضہ کی فکر مت کرنا۔ میں نے کہا۔ آپ رسالے کا تو اجراء فرمائیے۔ میں بھی اپنی حقیر خدمت پیش کر دیا کروں گا۔ اپنے ہونٹ سکیڑتے ہوئے فرمانے لگے۔ انشاء اللہ اسی ماہ رسالے کا پہلا شمارہ نکل رہا ہے۔ یہ جب بھی ملتے ہیں یہی کہتے ہیں۔ خدا شاہد ہے کہ دو سال ہو چکے ہیں لیکن ان کا پہلا شمارہ ابھی تک نہیں نکلا۔

اور یہ حضرت مصنف بننے کی کوشش میں رات دن ایک کر رہے ہیں۔ ان سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے اپنی کتاب کے پلاٹ اور کہانی کے متعلق ہی گفتگو کرتے ہیں اور ہر دفعہ ان کی کتاب کا مضمون اور ان کی گفتگو کا موضوع نیا ہوتا ہے۔ یہ حضرت اکثر فرماتے ہیں کہ کتاب چھپنے کی دیر ہے اہل قلم حضرات بھی میری اُستادی کا لوہا نہ مان جائیں تو کہنا۔ مجھے ان پر بہت رحم آتا ہے کیونکہ وہ ابھی تک کسی کتاب کے مصنف نہیں بن سکے اور ابھی ان کے کئی سال تک مصنف بننے کے کوئی آثار بھی نہیں ہیں۔

اِن حضرت کو دیکھئے:۔ میری دوستی پر بہت فخر کرتے ہیں اور اکثر کہا کرتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے کہ مجھے تم ایسا دوست ملا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اکثر مجھ سے خفا رہتے ہیں اور کئی کئی دن سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔

ذرا اِن حضرت کی شکل بھی ملاحظہ فرمائیگا:۔ میرے بہت پرانے دوست ہیں اکثر اسی تاک میں رہتے ہیں کہ میں کرسی پر بیٹھنے لگوں اور یہ کرسی نیچے سے کھینچ لیں۔ اس طرح مجھے فرش پر گرا کر یہ حضرت بے حد خوش ہوتے ہیں۔ اور اگر کبھی کسی ٹانگ یا بازو پر گرنے سے خراشیں آجائیں تو یہ صاحب فرانسیسی قہقہے بلند کرتے ہیں۔ اور بلند آواز سے کہتے ہیں۔ خدا کی قسم آج بہت ہی مزا آیا۔

اور یہ صاحب اکثر میری کتابوں اور کاپیوں پر اپنا "اسم گرامی" لکھ کر ان کا حلیہ بگاڑتے رہتے ہیں۔ اگر میں ناراضگی کا اظہار کروں تو وہ اپنے دو دانت نکال کر مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:۔

"دوست یہ میں اسلئے لکھتا ہوں کہ کہیں تم مجھے بھول نہ جاؤ۔"

یہ "ٹیڈی" دوست بھی ملاحظہ کیجیئے گا۔ مجھے اکثر دھمکیاں دیتے ہیں کہ اگر تم نے "ٹیڈیوں" کے خلاف یا "ٹیڈی لباس" کے خلاف کچھ لکھا تو تمہاری خیر نہیں ہے۔ گویا "ٹیڈی ازم" پر لکھنے کی پابندی عائد

(باقی دیکھیں صفحہ ۳۸)

ہے اور زندگی دکھ اور درد کا مجموعہ بن جاتی ہے اس میں شک نہیں کہ زندگی ہمارے لئے خوشیوں اور امنگوں کی پیامبر ہے۔ لیکن ان خوشیوں اور امنگوں کو حاصل کرنے کے لئے کچھ شرطیں ہیں۔ جب تک ان شرطوں کو پورا نہیں کیا جائے گا۔ ان خوشیوں اور امنگوں میں سے کچھ بھی ہمارے حصہ میں نہ آئے گا ہم چونکہ زندگی کی عائد کردہ پابندیوں کو پایۂ استحقار سے ٹھکرا دیتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ زندگی کی مسرتیں ہم کو سینے سے لگا لیں، ہماری پیشانی پر بوسہ دیں اور ہمارے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیریں۔ جب ہماری اس آس کو ٹھیس لگتی ہے تو ہم رٹ پٹانے لگتے ہیں۔ اور ہم کو زندگی سے نفرت ہونے لگتی ہے۔

زندگی پھولوں کی سیج نہیں۔ اس کی راہ میں ان گنت کانٹے بکھرے ہوئے ہیں۔ اگر ہم ہوشمندی سے نہ چلیں گے تو کوئی نہ کوئی تیز کانٹا پاؤں میں اُتر جائے گا۔ پھر اسکی چبھن اور کھٹک ہمارا سکون چھین لے گی۔

زندگی کی راہوں میں ہماری چال میں لڑکھڑاہٹ کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟ ہم اس کا سبب جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتے

جب کوئی کانٹا پاؤں میں چبھ جاتا ہے تو کبھی اس کو الزام دیتے ہیں اور کبھی اس کو الزام دینے لگتے ہیں

ہم چونکہ اپنے کندھوں پر آرزوؤں اور امنگوں کا بوجھ برابر لادتے رہتے ہیں اور لادتے چلے جاتے ہیں.... اور جب آرزوئیں اور امنگیں تشنۂ تکمیل رہتی ہیں تو زندگی ایک بوجھ بن جاتی ہے۔ اس وقت ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اس دنیا میں ہر خواہش پوری نہیں ہوتی۔ ہم پر مشکلات اور مصیبتیں آتی ہیں۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ ہم ان مصیبتوں کا اظہار دوسروں پر نہ کریں۔ کیونکہ حقیقت کو چھپانا اور ہنس ہنس کر سہنا ہی تو زندگی کی معراج ہے۔ دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں جسے خوشی کے ساتھ رنج اور غم کے ساتھ خوشی نہ ملی ہو زندگی تو خوشیوں اور غموں کے حسین امتزاج کا نام ہے۔ ہمیں زندگی کے ہر چیلنج کو قبول کر لینا چاہیئے ہمت و مردانگی سے مشکلات و حوادث کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

مشکلات کا سامنا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ دوسروں کے دکھ درد میں شرکت اختیار کی جائے، اس طرح دوسروں کے کام آکر اپنے دل کو بھی سکون اور اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ اور انسان کے فطری جذبات کی تسکین بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ فطرت ہم سے تقاضہ کرتی ہے کہ ہم دوسروں سے مل جل کر زندگی گزاریں۔ اس سے زندگی میں دلچسپی اور دلکشی پیدا ہوتی ہے۔

یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم اپنے لئے دوسروں کو ہمدرد نہیں پاتے۔ صبح سے شام تک کتنے لوگ ہمارے پاس سے گزر جاتے ہیں۔ لیکن وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے کہ ہم کس حال میں۔ اور کیا ہم کو ان کی طرف سے ہمدردی کی ضرورت ہے کہ نہیں؟ کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہماری ذات میں اتنی کشش نہیں ہے کہ ہمارے پاس سے گزرتے ہوئے ان کے قدم خود بخود رُک جائیں۔ اور ہمارے حال کی جھولی میں ہمدردی کے دو چار

لفظ ڈال دیں اور اگر کوئی ہمارے پاس سے منہ پھیر کر گزر جاتا ہے تو یہ اس کی خطا نہیں۔ یہ تو سراسر ہمارا قصور ہے۔ اس کو معلوم کرنے کے لئے ہم کو خود اپنی ذات کا جائزہ لینا چاہیئے۔ ہم کو یہ پوری طرح جان لینا چاہیئے کہ ہماری سرد آہیں اور ہمارے گرم آنسو زندگی کے تقاضوں میں کوئی ترمیم نہیں کر سکتے۔

جب تک ہم اپنا محاسبہ نہیں کریں گے نہ کوئی آنکھ ہمارے لئے نم ہوگی۔ نہ کوئی دل ہمارے لئے دھڑکے گا اپنا محاسبہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے دل میں دوسروں کے لئے محبت، ایثار اور ہمدردی کے جذبات پیدا کریں۔ کیونکہ محبت، ایثار اور ہمدردی کے جذبات اخلاق کو تشکیل دیتے ہیں اور زندگی کی ساری لطافتیں اخلاق ہی کی بدولت قائم ہیں، اخلاق ہی سے زندگی متوازن ہوتی ہے۔ یہی وہ معیار ہے جس پر پورا اترنے کے بعد آدمی اپنے لئے اور پھر دوسروں کے لئے اطمینان کا باعث بنتا ہے۔ آدمی کی یہ بہت بڑی بھول ہے کہ وہ خود تو دوسروں کے لئے مفید نہیں بنتا۔ لیکن دوسروں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ ان کی ذات سے ان کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے۔ یہی وہ بھول ہے جس کی وجہ سے زندگی تلخ ہو جاتی ہے اور ماحول کاٹنے کو دوڑتا ہے۔

زندگی کو خوشیوں سے مالا مال کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کا سرچشمہ خود ہمارے اندر ہو۔ اگر ہم اپنے آپ کو نظر انداز کرتے رہیں گے تو کبھی کوئی ہما ہمارے سر سے نہیں گزرے گا کہ اچانک ہمارے سر پر سعادت کا تاج چمکنے لگے۔ یہ ایک خواب ہے۔ یہ ایک تصور ہے، جس کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ جو لوگ اپنی اس تصوراتی دنیا میں گھومتے پھرتے ہیں ان میں اتنی سکت نہیں ہوتی کہ حالات کا مقابلہ کر سکیں۔ مانا کہ تصوراتی دنیا بہت حسین ہوتی ہے لیکن اس کی بنیاد بھی تو آنسوؤں پر ہوتی ہے۔ وہ چہرے جو دن کی روشنی میں مسکراتے، چمکتے اور دمکتے نظر آتے ہیں۔ رات کی تنہائیوں میں سب سے زیادہ دکھی اور افسردہ ہوتے ہیں۔ تصوراتی محل مسمار ہو جاتے ہیں۔ عملی دنیا میں قدم رکھ کر ہی اس شیرینی اور تلخی کا احساس ہوتا ہے ع

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

رعنائیٔ خیال

—o تم مسکرائے اور مجھ سے کوئی بات نہ کی میں نے محسوس کیا یہی وہ بات تھی جس کا مدت سے انتظار تھا۔

—o آبشار یہ گیت گاتا ہے کہ جب میں آزادی پا لیتا ہوں تو سراپا گیت بن جاتا ہوں۔

—o درخت پنجوں پر کھڑے آسمان کو جھانک رہے ہیں۔ گویا زمین کی بے قرار تمنائیں ہیں۔

—o بادل کا ایک ٹکڑا آسمان کے ایک گوشہ میں عجز کے ساتھ قائم تھا۔ صبح نے آکر اسے سنہری تاج پہنا دیا۔ (مرسلہ نصیر الحق ۹ے سال دوم)

جوہر کا جہاں

خلدِ حقیقی سے نکلا ہوا آدم قرن با قرن سے اللہ کی قدرت کے پُراسرار نظام کی تحقیق میں معروف ہے۔ یہاں اس کے لئے کوئی "شجرِ ممنوعہ" نہیں۔ بلکہ ارشاد ہوا کہ قصر پستی کاہ و رفعت کوہ پر غور و فکر کرو۔ تا ذہن خالی ازلی و ابدی کی عظمت و جبروت کا ادراک پاسکے۔ گھاٹیوں میں اچھلتی کودتی ندیوں، سر بفلک برف پوش چوٹیوں، جگمگاتے ستاروں، نور برساتے چاند اور سورج کی حیات بخش کرنوں نے ہمیشہ انسان کو سوچنے پر مجبور کیا۔ کیا اور کیوں ؟

ارتقا کے اوّلین ادوار کے انسان نے مظاہر فطرت کو دیوتا مان کر پوجا شروع کردی۔ وقت کا کارواں بڑھتا رہا۔ کچھ لوگ آئے جنہوں نے کائنات کی ماہیت پر غور و فکر کرکے چند نتائج اخذ کئے۔ مگر وہ اس کا عملی اطلاق ثابت کرنے پر قادر نہ تھے۔ زمانہ کروٹیں لیتا رہا۔ ذہنوں پر جمی برف پگھلتی رہی۔ اور اس برف کے پانی سے علم کے سوتے پھوٹتے چلے گئے۔ کروڑوں نوری سال کے فاصلہ پر واقع ستاروں کی روشنی کرۂ ارض کو منور کرتی رہی۔ اور بالآخر نور پھیلا۔ انسان نے آگ دریافت کی۔ تاریک غار اس نور سے جگمگا اٹھا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ اسے کیونکر قابو میں رکھے۔ اور جب اس نے اس پر قدرت پائی تو اسی آگ نے اس کو حیات پرور حرارت۔ بہتر غذا اور بے پناہ قوت کے خزانے بخشے۔ انسانی دماغ کی ان تھک محنت اور انسانی ہاتھوں کی ان تھک مشقت کا صلہ اسے کائنات کے شعور و ادراک کی صورت میں ملا۔ اس نے بہت کچھ ایجاد کرلیا۔ اس کی ہمہ جو تجسس پسند طبیعت نے بے شمار ایجادات کو جنم دیا۔ اب وہ اپنے مشاہدات و نتائج کا عملی ثبوت دینے کے قابل ہوگیا تھا کئی سقراط زہر کے پیالے پی گئے اور آج انسان کی نظریں ان ستاروں کا مشاہدہ کررہی ہیں۔ جو اس کی ننھی سی دنیا سے اربوں نوری برس کے فاصلہ پر جگمگا رہے ہیں۔

سائنس کی اس ترقی نے جہاں انسان کو خلائے بسیط میں پہنچا دیا ہے۔ وہیں انسان نے دھرتی کا سینہ بھی چیر ڈالا ہے۔ اور یوں پستی کاہ و رفعت کوہ کی سی صورت پیدا ہوگئی ہے۔ آج انسان اس کائنات کی

اکائی — جوہر (atom) کی گتھیاں سلجھا رہے ہیں اس امید پر کہ شاید وہ "کیا اور کیوں" اس صدیوں پرانے سوال کا جواب پا جائے۔

۴۰۰ قبل مسیح یونان میں دیمقراطیس نے خیال ظاہر کیا کہ ہر چیز ناقابل تقسیم ذرات۔ جوہر سے بنی ہے۔ اور کائنات میں ماسوا جوہر اور کچھ نہیں۔ دیمقراطیس کے ۳۰۰ برس بعد ایک رومی لوقراطیس (Lucretius) نے اس خیال کو تقویت بخشی۔ اور دوبارہ کہا کہ تمام اشیاء نظر نہ آنے والے ذرات سے مل کر بنی ہیں۔ مگر وہ زمانہ ان نظریات کے لیے خوشگوار نہ تھا۔ وہ لوگ اپنے نتائج کے عملی اظہار سے قاصر تھے۔ ارسطو کے خیالات نے ان نظریات کو درگور کر دیا۔ اور بھلا انسان کی خوگر پیکر محسوس نظر کس طور ماننے کو تیار ہوتی۔

قرون وسطی میں بے شمار لوگوں نے سونے کی تلاش میں ان تھک صنعت و تجربات سے علم کیمیا کا باب کھولا۔ جو کہ جوہر کی ایجاد کی بنیاد ثابت ہوا۔ ان کے "خیالی سونے" نے آج دنیا کو جوہر کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے۔

آیئے۔ آج ان چند لوگوں سے ملیں جنہوں نے جوہر کے میدان میں اپنے علم و ہنر کے جوہر نمایاں کئے۔

۱۷ ویں صدی میں:۔ اطالوی سائنسدان پائیری گیسنڈی (Pieri Gassendi) نے دیمقراطیس و لوقراطیس کے جوہری نظریات کو تسلیم کر لیا۔ آئرشی سائنسدان رابرٹ بائل (Robert Boyle) نے کہا کہ تمام اشیاء جوہروں سے مل کر بنی ہیں۔ اور دو اشیاء کا ملاپ درحقیقت دو اشیاء کے جوہروں کے ننھے ملاپ سے ایک نئی شے کو جنم دیتا ہے۔ برطانوی سائنسدان نیوٹن (Newton) نے خیال ظاہر کیا کہ روشنی کی شعاعیں جوہر کی طرح کے ذرات پر مشتمل ہیں جو کسی نور کے منبع سے پھوٹتی ہیں۔

۱۸ ویں صدی میں:۔ فرانسیسی سائنسدان اینٹوئی لیوائزے (Antoine Lavoisier) نے بنیادی عناصر دریافت کر کے ارسطو کے اس نظریہ کو رد کر دیا کہ ہوا ایک عنصر ہے۔ اس نے ثابت کر دیا کہ ہوا ایک عنصر نہیں بلکہ ایک آمیزہ ہے۔ اس کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ جوہروں اور کیمیائی تعاملات میں باہم کوئی رابطہ موجود ہے۔ اطالوی سائنسدان الیسانڈرو وولٹا (Alessandro Volta) نے دریافت کیا کہ برقی رو جوہروں کے جھرمٹ یعنی سالمات کی تحلیل کر سکتی ہے۔

۱۹ ویں صدی میں:۔ برطانوی سائنسدان جان ڈالٹن (Jhon Dalton) نے معلوم کیا کہ جب عناصر باہم ملاپ کرتے ہیں۔ تو وہ ایک مقررہ وزنی نسبت میں متحد ہوتے ہیں اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ عناصر بہت چھوٹے ذرات

پرمشتمل ہوتے ہیں۔

اطالوی سائنسدان امادیو اووگیڈرو (Amadeo Avogadro) نے مختلف سالمات کا علم حاصل کیا۔ اور پانی کو بطور مثال پیش کیا (پانی کے ایک سالمہ میں آکسیجن کا ایک اور ہائیڈروجن کے دو جوہر ہوتے ہیں)

ایک برطانوی ماہر نباتیات رابرٹ براؤن (Robert Brown) نے بغیر پھول کے پودوں کے تولیدی خلیوں (spores) کے درمیان پانی کے ایک قطرہ کی مسلسل حرکت کا مشاہدہ ایک طاقتور خوردبین سے کیا۔ پانی کے سالمات کی حرکت کے سبب یہ تولیدی خلیئے بھی متحرک تھے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ انسان کو معلوم ہوا۔ کہ اس کی گردوپیش کی اشیاء کے سالمات متحرک ہیں۔

فرانسیسی سائنسدان ہنری بیکیورل (Henri Becquerel) نے مشاہدہ کیا کہ یورنیم کے نمک فوٹوگرافی کی پلیٹ پر اثر انداز ہوتے ہیں خواہ ان پلیٹوں کو کتنا ہی کس کر کالے کاغذ میں لپیٹا جائے۔ یہ نمک عجیب شعاعیں خارج کرتے تھے۔

برطانوی سائنسدان سرولیم کروکس (Sir William Crookes) نے کیتھوڈ رے ٹیوب (Cathode Ray Tube) ایجاد کی جو بعد میں ٹیلیویژن پکچر ٹیوب کا پیش خیمہ بنی۔

جے۔جے تھامسن (J.J. Thomson) نے اس ٹیوب کی مدد سے جوہر کے دو حصے۔ الیکٹران اور پروٹان ایجاد کئے مثلاً

جرمن سائنسدان ولہیم کونریڈ (Wilhelm Conrad) نے خورد طویل موج والی شعاع ایجاد کی۔ یہ شعاعیں روشنی کی شعاعوں کے مماثل ہیں مگر ان سے چھوٹی ہیں۔ کونریڈ نے انہیں X-Ray "لاشعاع" کا نام دیا۔ کیونکہ وہ اس کا منبع دریافت کرنے سے قاصر تھا۔

فرانسیسی خاتون میری کیوری (Marie Curie) نے ریڈیم کا مطالعہ کیا جو کہ یورنیم سے بھی زیادہ تابکاری اثرات کی حامل دھات ہے۔ ریڈیم سے بھی شعاعیں شعاعیں خارج ہوتی تھیں۔ اور یہاں پھر سوال پیدا ہوا کہ ان شعاعوں کے اخراج کا سبب کیا ہے؟

۲۵ ویں صدی میں:۔ برطانوی سائنسدان ارنسٹ رتھرفورڈ ریڈیم کی تحقیق میں مادام کیوری سے بھی آگے نکل گیا۔ اس نے سیسے کے ایک چھوٹے ڈبہ میں صرف ایک چھوٹا سا سوراخ شعاعوں کے اخراج کے لئے رہنے دیا۔ یوں اسے شعاعوں کی تین اقسام الف Alpha ب Beta اور ج Gamma دریافت کیں اور بالآخر الف Alpha شعاعوں کی مدد سے وہ جوہر کے مرکزہ کو دریافت کرنے میں کامیاب ہوا۔

۱۹۰۵ء میں عظیم سائنسدان البرٹ آئن سٹائن (Albert Einstein) نے نظریہ اضافت

پیش کیا کہ کمیت کو توانائی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اس مشہور کلیہ کی حسابی صورت یوں پیش کی۔

$E = mc^2$

E ... Energy   m ... mass

c .... speed of light

(186324 miles Per Second)

یعنی توانائی برابر ہوگی اس کمیت کے جسے روشنی کی رفتار کے مربع سے ضرب دی جائے۔ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار تین سو چوبیس میل فی سیکنڈ ہے اور اس کا مربع برابر ہوگا 34,716,632,976 Miles per Second کے۔

اس کلیہ سے یہ ظاہر ہو گیا کہ انتہائی معمولی کمیت کو بے پایاں توانائی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اس نظریہ نے سائنسدانوں کو جوہر کی مخفی قوت کی طرف متوجہ کر دیا۔ وہی جوہر جو آنکھ سے نظر نہیں آتا لیکن اپنے اندر توانائی کے بے پایاں خزینے لیئے ہوتے ہے۔

۱۹۱۲ء میں نلز بوہر Niels Bohr نے جوہر کی متحرک ساخت کی تصاویر لیں۔

۱۹۳۲ء میں برطانوی سائنسدان جیمز چیڈوک James Chadwick نے نیوٹران ایجاد کیا۔ اور ۱۹۳۸ء میں دو جرمن سائنسدانوں اوٹو ہان Otto Hahn اور فرٹز سٹراسمن Firtz Strassmann نے یورنیم کے جوہر کے مرکزہ پر نیوٹران کی بارش سے اسے توڑ ڈالا۔ یوں انسان نے جوہر کو پہلی بار مسخر کیا۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْأَرْضِ

تحقیقاتی ماہرین جوہر کی قوتوں سے نبرد آزما تھے۔ اور دوسرے سائنسدان ان قوتوں کے عملی اطلاق پر غور کر رہے تھے۔ اب آیئے ان چند عملی اطلاقات کا جائزہ لیں۔

دنیا کے بہت سے ممالک میں معدنی ذخائر کی کمی ہے۔ جوہری توانائی جو قوت کا بے پناہ خزانہ ہے۔ ان معدنی ذخائر کی کمی نعم البدل ثابت ہوئی ہے۔ چنانچہ برطانیہ نے جوہری ریکٹروں کے قیام کی طرف خصوصی توجہ دی ہے۔ اور ۱۹۷۵ء تک وہاں بارہ جوہری ری ایکٹر کام شروع کر دیں گے۔ اور ۲۰ ملین ٹن کوئلہ کی بچت ہوگی۔ جو پلاسٹک ٹیکسٹائل اور دھاتوں کی صنعت میں کام آئے گا ص۲۹

ہمارے ملک میں بھی تیل کوئلہ اور گیس کی کمی ہے۔ چنانچہ حکومت پاکستان بھی ملک کی ترقی و استحکام کی خاطر جوہری ری ایکٹروں کے قیام میں مصروف ہے۔ ایک ری ایکٹر اسلام آباد میں کام کر رہا ہے۔ دنیا کے دوسرے ملک بھی جوہری توانائی پر کام کر رہے ہیں۔

توانائی کے حصول کے علاوہ جوہر سے اور بے شمار فائدے اٹھائے جا رہے ہیں۔ بعض عناصر کے ہم جا Isotopes تابکاری Radioactive خواص کے حامل ہوتے ہیں۔

یہ ہم جا مختلف صورتوں میں انسانی تعمیر و ترقی میں
مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔

چند اقسام کے پلاسٹک پر اگر ہم جا سے گیما
شعاعیں ڈالی جائیں تو یہ زیادہ قیام پذیر ثابت ہوتے
ہیں اور بے پناہ تپش برداشت کر لیتے ہیں۔ تابکار
ہم جاؤں کے ذریعہ ربڑ اور کاغذ وغیرہ کی موٹائی
جانچ کر مصنوعات کی نفاست اور پائداری میں
اضافہ کیا جا رہا ہے۔ تیل کی کمپنیاں پائپوں کے ذریعہ
دور دراز سلسلوں میں بہتے ہوئے تیل کی مقدار بھی انہی
ہم جاؤں کے ذریعہ معلوم کرتی ہیں۔ تیل میں ہم جا کی
کچھ مقدار ملا دی جاتی ہے۔ اور تابکاری معلوم کرنے
والے آلات تیل کی مقدار ظاہر کر دیتے ہیں۔

زراعت اور کھیتی باڑی میں بھی ہم جاؤں سے
بہت مدد لی جا رہی ہے۔

زراعت و کھیتی باڑی میں ہم جاؤں سے بہت
مدد لی جا رہی ہے۔ اور ان کے ذریعہ بہتر فصلوں کا حصول
ممکن ہو گیا ہے۔ کھاد کے ساتھ ملا کر ہم جاؤں کو پودوں
کی جڑوں میں پھینک دیا جاتا ہے۔ یوں ماہر نباتیات
اس بات کی جانچ بھی کر سکتے ہیں کہ پودے اپنی افزائش
کے کس مرحلے پر کھاد کی کس قدر مقدار جذب کرتے
ہیں اور یہ نتائج اعلیٰ فنی تحقیق کی بنیاد ثابت ہو سکتے
ہیں۔

خوراک کو ایک طویل عرصہ تک محفوظ کرنے
کے لیے گیما شعاعوں کے ذریعہ تجربات ہو رہے ہیں
آج سے تین چار برس قبل جن ٹماٹروں کو محفوظ کیا
گیا تھا وہ آج بھی اسی حالت میں ہیں۔ سائنسدان اس
روز کے منتظر ہیں جب اختلاف آب و ہوا کے باوجود
بھی خوراک کو طویل عرصہ تک محفوظ رکھا جا سکے گا۔
اور یوں انسان کو بھوک کے بنیادی مسئلے سے نجات
ہو گی۔

پودے سورج کی روشنی میں کلوروفل کی موجودگی
کے سبب ضیائی تالیف photosynthesis
کے ذریعہ انتہائی پیچیدہ کیمیائی تعاملات کر کے اپنی
خوراک تیار کرتے ہیں۔ ہم جاؤں کے ذریعہ اس
ضیائی تالیف کے کیمیائی تعاملات کا پتہ لگا کر انسان
اس قابل ہو جائے گا۔ کہ وہ تجربہ گاہ میں انہی کیمیائی
تعاملات کے ذریعہ خوراک تیار کر سکے۔

انسانی جسم کے اندر ہر لمحہ بے شمار کیمیائی تغیرات
ہوتے رہتے ہیں۔ ہم جاؤں کے ذریعہ ان تغیرات
کی ماہیت معلوم کی جا رہی ہے۔ مثلاً جسم پانی اور
خوراک کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔ ایک سرخ خلیہ
جسم کے لیے کب تک کارآمد رہتا ہے؛ خون میں
کیلسیم کی مقدار کس طرح برقرار رہتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ
رہتی ہے؛ وغیرہ وغیرہ ص۳۵

بہت سے کیمیائی تغیرات اس قدر پیچیدگی
و سرعت سے واقع ہوتے ہیں کہ انسان یہ بتانے سے
قاصر ہے کہ کب کیا ہو گا؛ مگر تابکاری ہم جاؤں کی
مدد سے ہم ان تغیرات کو جانچ سکتے ہیں۔ مثلاً آیوڈین
کو Thyroid Gland کی خرابی میں استعمال
کیا جاتا ہے۔ آیوڈین مریض کے اس غدود میں داخل

ہو کر خرابی دور کرنے کے علاوہ معالج کو یہ بھی بتا دیتی ہے کہ غدود میں کیا کیمیائی تغیرات عمل پذیر ہیں۔ دماغی غدودوں کی بیماری کے لئے آیوڈین تانبے اور میگا نیز کے مرکبات مفید ثابت ہو رہے ہیں۔

سرطان کی وجوہات کا سراغ لگانے کے لئے لازم ہے کہ خلیوں کی لطیف ساخت کو جانچا جائے۔ کیونکہ سرطان خلیوں کی بے قاعدہ افزائش کا نام ہے ان کی ساخت کے تفصیلی مطالعہ کے بعد ان کی بے قاعدہ افزائش پر غور کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر سرطان کی ان وجوہات سے باخبر ہو کر اس کا علاج معلوم ہو سکتا ہے۔ خلیوں کی ساخت اور ان کا زندگی کے ساتھ انتہائی پیچیدہ رابطہ ہم جاتوں کے ذریعہ معلوم کیا جا رہا ہے۔

ابھی تو انسان نے جوہر کی دنیا میں قدم رکھا ہے۔ اور فطرت کی صناعی نے انسان کو حیران کر دیا ہے۔

کبھی اس کی خاطر ذرّے ذرّے کا جگر چیرا
مگر یہ چشم حیراں جس کی حیرانی نہیں جاتی

اور یہ چشم حیراں مجبور ہے کہ اپنے خالق کے آستانہ پر اپنے سر کو جھکا دے۔

وَاللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

کیا عجب تُو نے ہر اک ذرہ میں رکھے ہیں خواص
کون پڑھ سکتا ہے سارا دفتر ان اسرار کا

(درثمین)

عربوں کے حکیمانہ مقولے

— کسی کام میں مشغول یا ہو سکے سے مشورہ مت لو خواہ وہ کتنا ہی ہوشیار یا دانشمند کیوں نہ ہو۔

— ظلم نہ کرو ورنہ تمہیں بھی ضرور کوئی ظالم مل جائے گا۔

— کچھ جلد بازیاں ہی تاخیر کا موجب ہوتی ہیں۔

— جب دل تنگ ہو جائے تو زبان کھل جاتی ہے۔

— چوکنے اور چالاک شخص کو اس جگہ سے نقصان پہنچتا ہے۔ جہاں سے وہ بے فکر ہوتا ہے۔

— انسان کا آدھا حصہ اس کی زبان اور آدھا اس کا دل ہے۔ باقی تو گوشت اور خون کا ڈھانچہ ہے

(مرزا محمود احمد سال دوم)

گر تلاش زندگی ہے موت کے دامن میں دیکھ
شاید اس پردے کے پیچھے ہو نشانِ زندگی

زندگی بھر نہ ہوا فاش کسی پر بھی یہ راز
مر کے انسان خدا جانے کدھر جاتا ہے

طفیل ہشیارپوری

اوصاف احمد سکینڈایر

ایک یادگار سفر

تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی سائنس سوسائٹی کے زیر اہتمام قریباً ہر سال طلبا کا ایک مختصر گروپ مختلف سیاسی، تاریخی اور سائنسی اہمیت کے مقامات کی سیر کے لئے جاتا ہے۔

حسب معمول گزشتہ برس بھی اپریل کے آخری عشرہ میں ۱۵ طلباء کے ایک وفد نے سائنس سوسائٹی کے نگران جناب ڈاکٹر نصیر خان صاحب کی سرکردگی میں راولپنڈی منگلا ڈیم۔ واہ کینٹ۔ ہری پیکسلا اور اسلام آباد کا یادگار سفر کیا۔

۲۲ اپریل کا سورج مغرب کی سمت جھک چکا تھا۔ دھوپ میں تمازت باقی تھی نہ شاخوں میں جھجھن... پندرہ طلباء کا گروپ جس میں سنجیدہ طلباء بھی تھے۔ شریر بھی..... خاموش بھی..... اور چست و چالاک بھی..... ربوہ ریلوے سٹیشن پر ڈاکٹر نصیر خان صاحب کے ساتھ جناب ایکسپریس کا منتظر تھا.....

جناب ایکسپریس نے ہمیں انتظار کی زحمت سے بچا لیا۔ اور عین وقت پر سٹیشن پر آ گئی..... ہم اطمینان سے سوار ہوئے..... اور باتوں میں مصروف ہو گئے۔

اور جناب ایک سٹیشن سے دوسرے سٹیشن سے دوسرے سٹیشن پر رکتے ہوئے ہماری منزل قریب سے قریب تر کرنے میں مصروف ہو گئی۔... کھڑکیوں سے ہوا کے تھپیڑے کھاتے چاندنی کا لطف اٹھاتے رات ڈیڑھ بجے ہم جہلم پہنچ گئے۔

اتنی رات گزر جانے کے باوجود نیند کوسوں دور تھی۔ باتیں کرتے ادھر ادھر کے لطیفے سناتے... ریلوے سٹیشن کی انتظار گاہ کے بڑے بڑے بنچوں پر بے تکلفی سے دراز ہو گئے..... ابھی پوری طرح سونے بھی نہ پائے تھے کہ رات کا سکون ٹوٹ گیا۔ نیند ابھی آنکھوں میں ہچکولے لے رہی تھی۔ مگر ہم نے شوقِ سفر میں نیند کی دیوی سے معذرت کر لی اور ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گئے

۲۳ اپریل کا سورج مسکراتا ہوا ہولے ہولے مشرق سے جھانک رہا تھا۔ اڈے پر پہنچے تو کئی لاریاں ہماری منتظر تھیں۔ ہم ایک میں سوار ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ہم جہلم کی حدود سے باہر نکل رہے تھے۔ بس منگلا ڈیم کی طرف لاری اڑی جا رہی تھی۔... منگلا

میں امریکن کالونی دیکھ کر پہلی بار صفائی کا احساس ہوا .... صاف ستھرے مکان .... خوبصورت اور صاف سڑکیں .... گھاس کے وسیع پروربلاٹ .... بس طبیعت خوش ہوئی جھیل پر پہنچے .... سائنس دانوں کے کارناموں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا .... دور دور تک پانی پھیلا ہوا تھا .... انجینئر نے پانی کا رخ موڑ دیا تھا ہم نے جھیل کے کنارے پر کھڑے ہو کر دوربین سے مختلف اطراف میں دور دور تک دیکھا .... پھر یادگار کے طور پر یہاں کے بہت سے فوٹو اتارے ....

ہم شام قریباً ۵ بجے واپس جہلم پہنچ گئے۔ اور اس وقت پاکستان کے عبوری دارالحکومت راولپنڈی کے لئے سوار ہوئے۔ سفر کے دوران سورج شام کے دھندلکوں میں روپوش ہو گیا.... اندھیرا کائنات پر محیط ہو گیا۔ بس طلباء کے خوش و خرم گروپ کو لئے آگے سے آگے بڑھتی گئی۔ اور روشنیوں کا شہر راولپنڈی قریب سے قریب تر ہوتا گیا

رات مسجد نور راولپنڈی میں گزاری - ۲۴ اپریل کو اسلام آباد میں ایمی ری ایئر دیکھنے کا پروگرام تھا .... ہم مری روڈ سے ٹیکسیوں پر بیٹھے اور سڑکوں پر پھسلتے .... دور سے ہوائی اڈا اور ریڈیو پاکستان دیکھتے منزل تک پہنچ گئے ....

ایمی ری ایجیڈ دیکھ کر انسانی دماغ کی صلاحیتوں پر ایمان پیدا ہو جاتا ہے .... ایک کمزور اور مختصر سا وجود کیا کچھ کر لیتا ہے .... دو گھنٹے کے بعد واپس راولپنڈی آئے .... شام کو اسلام آباد کی سیر کا پروگرام تھا۔ وقت بہت تھوڑا تھا .... لیکن شوق نے مجبور کر دیا۔ اور ہم اسلام آباد کے لئے روانہ ہو گئے .... اسلام آباد دورِ جدید کی فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ شہر کا نقشہ بہت خوبصورت ہے .... بھلا خوبصورت کیوں نہ ہو۔ پاکستان کا دارالخلافہ جو ہے۔ .... اس پاکستان کا جو ہمارا پیارا وطن .... ہماری آرزوؤں امیدوں اور امنگوں کا امین ہے۔

اسلام آباد میں ہم نے پاکستان ہاؤس اور جامع مسجد دیکھی۔ جامع مسجد بہت خوبصورت ہے۔ اخبارات میں اس کی تصاویر تو بہت دفعہ دیکھی تھیں۔ مگر وہ بات کہاں جو دیکھنے میں ہوتی ہے۔ اسلام آباد کی عالیشان مسجد دیکھ کر خدا کی قدرت اور عظمت کا قائل ہونا پڑتا ہے — رات ۹½ بجے واپس روانگی ہوئی .... دن بھر کی تھکاوٹ کے باعث رات سب لوگ جلد ہی بستر دراز ہو گئے۔

جیتے ہو خدا حافظ اتنی سی گزارش ہے
جب یاد مری آئے ملنے کی دعا کرنا
(جلیل)

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں
(سودا)

محمد احسن اختر ملک ۔ سال دوم

فارم گائیڈ تحریک

فارم گائیڈ تحریک ۔ زیادہ غلہ اگاؤ مہم اور زراعت سے تعلق رکھتی ہے۔ اس تحریک کے سربراہ اس مملکت خداداد کے صدر محمد ایوب خاں ہیں۔ یہ تحریک دسمبر ۱۹۶۴ء کو معرض وجود میں آئی۔ اس کا مرکز ادارہ توسیع زراعت زرعی یونیورسٹی لائل پور ہے۔ فارم گائیڈ تحریک کے روح رواں ڈاکٹر عبدالرحیم چوہدری ڈائرکٹر ادارۂ ہذا ہیں۔

یہاں یہ تربیت کالج اور سکولوں کے طلباء کے علاوہ اساتذہ صاحبان یونین کونسلوں کے سیکرٹری اور زمینداروں کو بھی دی جاتی ہے۔ ہر ماہ کی یکم اور ۱۵ کو یہ کورس شروع ہوتا ہے۔ اور یہ کورس پندرہ دن کا رہتا ہے۔

اس میں مندرجہ ذیل مضامین کی تربیت دی جاتی ہے۔

۔ **کسانوں کی مشکلات** ۔ اس مضمون میں زمینداروں کی مشکلات اور ان کے حل بتائے جاتے ہیں۔

۔ **تحفظ نباتات** ۔ اس میں کیڑوں کی بیماریوں اور روک تھام کے لئے معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔

۔ **زراعت** ۔ اس مضمون میں زراعت کے طریقوں سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

۔ **باغبانی** ۔ اس میں پودوں کی حفاظت پیوند اور جگہ کا انتخاب وغیرہ بتایا جاتا ہے۔

۔ **تحفظ نباتات** ۔ حیوانات کی بیماریوں اور ان کے علاج سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

۔ **سول ڈیفنس** ۔ ہوائی حملہ سے بچاؤ اور فسٹ ایڈ کے متعلق بتایا جاتا ہے۔

۔ **رائفل ٹریننگ** ۔ رائفل کے ساتھ پریڈ اور اس کے اجزا کے متعلق بتایا جاتا ہے۔

۔ **اجتماعی ترقی** ۔ اتفاق کی برکتوں اور مل جل کر کام کرنے کے متعلق بتایا جاتا ہے۔

اس تحریک کے مقاصد مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) ملک کی اقتصادی و معاشی آزادی کی کوشش کرنا

(۲) پاکستانی کاشتکاری کی بے لوث خدمت کرنا

(۳) جدید طریقہ ہائے کاشت کی ترویج کی جائے۔

(۴) ہر تعمیری محکمہ کے عملہ سے فارم گائیڈ تعاون کرے۔

(۵) ترقیٔ دیہات کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔

(۶) اسلامی نظریات کا فروغ کیا جائے۔

(۷) معاشرتی اور اخلاقی برائیوں کو مٹانے کے لئے جہاد کیا جائے۔

(۸) اسلامی بہبود کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔

(۹) جہالت، لاعلمی اور تساہل کو مٹانے کی کوشش کی جائے۔

(۹) سماجی بہبود کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔

(۱۰) اجتماعی شعور کی بیداری کا جذبہ پیدا کیا جائے۔

محترم پرنسپل صاحب کے ارشاد پر ہمارے کالج کے طلباء بھی اس تحریک کے سرگرم عمل رکن بن چکے ہیں چنانچہ ہمارے کالج کے چھ طلباء نے ۱۵ جون تا یکم جولائی ۱۹۶۷ء کو فارم گائیڈ کی تربیت حاصل کی۔ ہمارے کالج کی یونٹ کا نام T (ح) ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری یہ یونٹ ضلع جھنگ کی پہلی اور واحد یونٹ ہے۔

اب تک مختلف کالجوں کے تقریباً ... طلباء اس کی تربیت حاصل کر چکے ہیں۔ اور تربیت حاصل کرنے کے بعد اکثر طلباء مختلف دیہاتوں میں جا کر اصلاحی اور مفید مشورے بتاتے ہیں۔

فارم گائیڈ کی تربیت کے سلسلہ میں نمایاں کام کرنے والوں کو انعامات بھی دیئے جاتے ہیں اور خدا کے فضل سے ہمارے کالج کے جن طلباء نے تربیت حاصل کی۔ ان میں سے ٹائٹ (محمد احسن اختر ملک) کو جناب عزت مآب خان محمد علی خان وزیر تعلیم مغربی پاکستان نے ۲۸ دسمبر ۱۹۶۷ء پہلی سالانہ فارم گائیڈ ریلی کے موقعہ پر نمایاں کارکردگی کا انعام عطا فرمایا۔

اس تحریک میں ہمارے کالج کے مندرجہ ذیل طلباء شامل ہیں۔

(۱) فارم گائیڈ لیڈر۔ محمد احسن اختر ملک XII

(۲) فارم گائیڈ منظور احمد IX

(۳) " " مرزا محمود احمد XII

(۴) " " محمد باسط "

(۵) " " محمد عظیم "

(۶) " " ارشد علی XI

اس تحریک کے متعلق تعارف کروانے کا بڑا مقصد یہ ہے کہ ہمارے کالج کے طلباء کو چاہیئے کہ وہ اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ اس تربیت کے ذریعہ ہم بڑے وسیع پیمانے پر خدمتِ خلق کے کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں دیہاتیوں کو مفید مشورے دیکر اپنے ملک کی معاشی ترقی کا مفید ذریعہ بن سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ کالج کے اکثر طلباء اور خصوصاً دیہاتی طلباء اس تحریک میں ضرور شامل ہوں گے۔

موسم بہار اور موسم گرما کی تعطیلات کے دوران اس کی تربیت حاصل کرنے کا ایک سنہری موقعہ ہے۔ جو طلباء کو کسی طرح اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیئے تاکہ ملکی خدمات کے ساتھ ساتھ ہمارے کالج کا نام بھی روشن ہوسکے۔

منظور احمد بہادر۔ ایف ایس سی سال دوم

کالج کی زندگی

(فرسٹ ایر کے طلباء سے معذرت کے ساتھ)

دنیا بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم
کن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

نہ جانے اِس شعر کے کہنے والے نے دنیا کے متعلق سوچتے ہوئے کالج کی زندگی کی طرف دھیان کیوں نہ کیا۔ ورنہ ان کو تو کہنا چاہیے تھا ؎

کالج بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم
کن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

اور ہے بھی تو ٹھیک سو! دنیا کی رنگینیاں خواہ کتنی ہی دلکش کیوں نہ ہوں کالج کی رنگینیوں سے مقابلہ ہی نہیں کر سکتیں۔ سکول کی متواتر دس سال کی "قید کلیاں" محض اس خوشی سے بھگت لیتے ہیں کہ وہ جلد یا بدیر کالج کی فضا میں قدم رکھنے والے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ زمانہ سکول میں کالج کی رنگینیاں بہت ہی پرکشش دکھائی دیتی ہیں — اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ طالب علم کالج کے ماحول میں قدم رکھ ہی لیتا ہے۔ کہاں سکول کے "ڈنڈے" اور کہاں کالج کی پُر سکون آزادی۔ ماحول کی یکسر تبدیلی ایک انوکھے ذوق کو جنم دیتی ہے۔ وہی لڑکے جو ماتہ سکول میں کلاس میں "مرغ" بنتے تھے آج ان کا دماغ (زمین سے نہیں) آسمان سے باتیں کر رہا ہوتا ہے۔ ہر قسم کے خوف سے نجات اور ہر قسم کے تفکرات سے آزادی ان میں ایک خاص قسم کی خود اعتمادی (بلحاظ وقار و متانت) پیدا کرتی ہیں۔

کالج میں آ کر جو نمایاں زود اثر تبدیلی رنگ لاتی ہے وہ تبدیلیٔ لباس ہے۔ ملیشیا کی وردی اب "لنڈن" کی پتلون اور "سمر" کے خوشنما قمیص میں بدل چکی ہے۔ عام جوتوں کی جگہ باٹا کے نوکدار جوتوں نے لے لی ہے۔ جس کی نوک تلوار سے زیادہ تیز اور شاید پل صراط سے زیادہ باریک ہے جرابیں خواہ پھٹی ہوئی ہی ہوں مگر بہرحال لازمی ہیں۔ رف کاپی کی بجائے اب دستِ مبارک میں خوشنما قیمتی فائل نوٹ بک ہے۔ جس میں آئینہ اور کنگھی کا نزول سے زیادہ لازمی ہیں سکول کے دوران اگر گھڑی تھی تو اس کی جگہ اب ماشاء اللہ نئی چمکدار رسٹ واچ صاحبہ آگئی ہیں۔

بالوں کی آرائش و زیبائش اب زندگی کا لازمی جزو بن کر رہ گئی ہے۔ دن میں کم از کم سات آٹھ مرتبہ بالوں کو کنگھی کی جاتی ہے جس کا اندراج نوٹ بک میں موجود ہوتا ہے۔

کالج میں جائیے کوئی فضا آپ سے ہوم ٹاسک (Home task) کے بارے میں نہیں پوچھیں گے سارا دن بے فکری سے گزاریئے۔ اگر طبیعت مبارک مائل ہو تو پیریڈ میں حاضر ہوں ورنہ بڑی خوشی سے یہ وقت ٹک شاپ میں خوش گپیوں میں گزاریں۔

کالج میں قدم رکھتے ہی مزاج شریف میں بہت تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ سکول میں جبکہ اردو کے مضمون میں کامیاب بھی مشکل سے ہوتے تھے۔ اب اردو ادب ماشاء اللہ بہت ترقی کرتا جاتا ہے کہیں "غزلیں" ہو رہی ہیں تو کہیں "افسانے" لکھے جا رہے ہیں۔ بعض منچلے اصحاب تو پورا ناول ہی لکھ مارتے ہیں۔ اور پھر اسے چھپوانے کے انتظامات کئے جاتے ہیں (شاید اس لئے کہ کوئی بھی پبلشران کے ناول کو چھپوانے پر رضامند نہیں) سکول میں جہاں مولا بخش کا ڈر ہوتا تھا اب کالج میں اساتذہ پر نقطہ چینی کرنا اپنے فرائض میں سمجھتے ہیں۔

سکول میں جہاں سارا دن متواتر حاضر رہتے تھے۔ اب کالج میں صرف ایک پیریڈ پڑھنے کے بعد "بور" ہونے لگتے ہیں۔ صرف یہیں نہیں۔ یہ بوریت تقریباً ہر بات میں سب سے آگے آگے ہوتی ہے اگر پروفیسر پڑھا رہے ہوں۔ تو یہ بیٹھے بیٹھے بھی بور ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بوریت پیریڈ ختم ہونے تک اپنے آخری مقام (M. Climax) پر ہوتی ہے۔ اس لئے آئندہ پیریڈ میں آرام کرنے کا پروگرام بن جاتا ہے۔ ہوسٹل میں نماز کی گھنٹی بجے تو یہ صاحب بہادر "بور" ہو جاتے ہیں — کسی ادبی محفل میں جا نکلیں تو بجائے اس کے کہ غور سے تقاریر وغیرہ سنی جائیں۔ بوریت رنگ لاتی ہے۔

سکول کی نسبت کالج میں پسینہ بھی زیادہ ہی آنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہاتھ میں نفیس رومال ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ جو وقتاً فوقتاً پسینہ (اگر نہ بھی ہو) پونچھنے کے کام آتا رہتا ہے۔

اب لیجئے صاحب بہادر کے "موڈ" کو۔ سکول کے دوران آپ کو علم تک نہیں تھا۔ کہ "موڈ" کیا بلا ہوتی ہے۔ مگر اب ہر کام میں موڈ کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ مطالعہ شروع ہوا۔ مگر "موڈ" آڑے آیا۔ موڈ نہ ہونے کی وجہ سے کتاب بند کر دی گئی۔ آپ کسی کام کے بارے میں کہہ دیں تو صاحب کہیں گے کہ بھئی اس وقت موڈ نہیں ہے۔ بعض اوقات کا موڈ آف (Off) بھی ہو جاتا ہے۔ آپ کی تنقید ان کے موڈ کو زیادہ آف (Off) کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مضمون کے پڑھنے کے دوران ان کا موڈ آف ہونے لگا ہے۔ آنکھیں دکھا رہے ہیں۔ اچھا جی ہم چلے کہیں موڈ

عبدالشکور ۔ اولڈ سٹوڈنٹ

معاشرتی انقلاب

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ جب تک کسی پھوڑے کے اندرونی غلیظ مادہ کا علاج نہ لیا جائے وہ پھوڑا کبھی مندمل نہیں ہو سکتا۔ اگر اسے ایک جگہ سے دبا دیا جائے۔ تو دوسری جگہ سے لاوے کی طرح پھٹ کر باہر آ جاتا ہے۔ جس کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اسے اکھاڑ دیا جائے۔ اسی طرح معاشرتی برائیوں کے سدِّباب کے لئے ایک تجربہ کار حکیم کی مانند ان برائیوں کی جڑ کو اکھیڑنا چاہیئے اور جہاں تک میرا خیال ہے۔ معاشرہ کو پاک کرنے کے لئے ہر ایک فرد کو پاک کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ بقول علامہ اقبال ؒ ع

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

معاشرہ کی پاکیزگی کے لئے غیر ملکی مبصرین یا سائنس دانوں کی خدمات کی ضرورت نہیں۔ ہمیں معاشرہ کی برائیوں کا تجزیہ کرنے سے پہلے ایک طائرانہ نظر اس آغوش پر ڈالنی چاہیئے۔ جس میں پل کر ملت کا ہر فرد دنیا کے عملی میدان میں رونما ہوتا ہے۔ اور یہ پہلی پرورش گاہ والدین کا سایہ شفقت ہے۔ جس میں پل کر ہر فرد معاشرہ کے لئے ایک اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

والدین کا فرض صرف یہ نہیں کہ اولاد کو پال پوس کر بڑا کر دیا۔ اسے کھانے اور کمانے کے ہنر سکھا دیئے۔ اور اس کی شادی کر دی۔ بلکہ اس کے اخلاق و تہذیب کی اس کے مزاج کی اصلاح اس کی عادات کی درستی۔ اس کے خیالات او اعتقادات کی درستی بھی ماں باپ کا فرض ہے۔ افسوس ہے کہ بہت سے لوگ اس فرض سے غافل ہیں۔ کوئی بھی شخص تربیت اولاد کا فرض پوری طرح ادا نہیں کرتا تا وقتیکہ والدین اولاد کو خود اپنی شائستگی کا نمونہ نہیں دکھاتے اور ان کے ساتھ اپنا برتاؤ مختصانہ طور پر نہیں کرتے یہ ایک درجہ کی بے وقوفی ہے کہ اولاد کو اپنے کردار کی بری مثالیں دکھانا اور پھر ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ بڑے ہو کر زبانی پند و نصائح کتابی نصیحت پر کاربند ہو کر صالح اور نیک وضع ہوں گے۔

بہت سے لوگ اولاد کے ساتھ فائت درجہ کی شفتگی پیدا کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح ان کے عیوب سے آگاہی نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی بھی ہے تو عیب

کو عیب سمجھ کر نہیں بلکہ تقاضائے عمر اور نتیجہ ذہانت یا دوسرے طور پر تاویل کر کے خرابیوں سے درگزر اور چشم پوشی کیا کرتے ہیں۔ کوئی بھی نہیں جانتا کہ تربیت اولاد ایک فرض موقت ہے۔ جب تک لڑکے کم سن ہیں تربیت پذیر ہیں۔ جب بڑے ہو گئے تو ان کی تربیت مشکل یا متعذر بلکہ محال ہو جاتی ہے۔ اس لئے والدین کو چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو ایک ایسا نمونہ کے طور پر پیش کریں کہ بچے خود بخود متاثر ہوں۔

میری ڈائری کا ایک ورق

آج اٹھائیس مارچ ہے وہ بھی آج ہی کا دن تھا .... سورج شام کے دھندلکوں میں روپوش ہو چکا تھا ... فرحت بخش ہوا کے تھپیڑے ماحول کو خوابناک بنا رہے تھے ... میں ٹیبل لیمپ روشن کئے رائٹنگ ٹیبل پر جھکا ہوا تھا .... میرے سامنے ڈائری کا ایک صاف ورق کھلا ہوا تھا ... اور میں نے لکھنا شروع کیا ...

امشی! .....

جب شام کے سائے طویل ہونے لگتے ہیں تو تمہارا شفق رنگ چہرہ یاد آ جاتا ہے ... جب اندھیرا پھیلتا ہے تو دل سے ایک ہوک سی نکلتی ہے۔ وہ اٹھائیس مارچ کی ہی ایک شام تھی۔ جب تم مجھ سے جدا ہوئے تھے ... یورپ کی رنگینیوں نے تمہیں مجھ سے ہمیشہ کے لئے چھین لیا .... سوئٹزرلینڈ کی جھیلوں میں تم ڈوب گئے۔

آج اٹھائیس مارچ کو تم بری طرح مجھے یاد آ رہے ہو۔ یہ کل ہی کی بات ہے جب ہماری طویل ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ جب ہمیں باتیں کرتے گھنٹے گزر جایا کرتے تھے۔ اب بھی میں پہاڑ کی دوسری سمت باغ میں جاتا ہوں .... یاد ہے نا جب ہمارے دوسرے دوست تم سے پوچھتے کہ کہاں گئے تھے تو تم کہتے تھے افق کے پار ... اسی باغ میں اب میں اکیلا پھرتا ہوں ... میرے ساتھ کوئی نہیں ہوتا۔

اب میں اس باغ میں اداس اداس اور ویران ویران دل لئے جاتا ہوں تو باغ کی معطر ہوائیں مجھ سے پوچھتی ہیں .... بتاؤ تمہارا ساتھی کہاں ہے وہ سندر سندر ساتھی ... بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ... کتابی چہرہ ... میں انہیں کوئی جواب نہیں دے سکتا ...

میرے سندر سندر سپنے ٹوٹ گئے ہیں ...

(باقی دیکھیں صـ۶۴ پر)

منیر ثاقب ۔ سال اوّل

اگر تم چاہتے ہو.....

• اگر تم چاہتے ہو کہ دوسروں کے خیالات میں انقلاب پیدا کر کے ان کی تائید حاصل کر لو تو ان کی عزت و آبرو کا قدم قدم پر لحاظ رکھو۔

• اگر تم چاہتے ہو کہ دوسروں کو اپنا ہم خیال بناؤ تو ان کے ساتھ نرمی سے کلام کرو۔

• اگر تم لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتے ہو۔ تو اپنی غلطی بہت جلد صدق دل سے تسلیم کر لو۔

• اگر تم انکاری جواب دینا چاہتے ہو۔ تو اس کے لئے ایسے الفاظ انتخاب کرو جو مخاطب کو ناگوار نہ گزریں۔

• اگر تم لوگوں کی مایوس زندگی میں انقلاب پیدا کر دینا چاہتے ہو تو ان کی حوصلہ افزائی کر کے انکی سوئی ہوئی طاقتوں کو بیدار کرو۔

• اگر تم چاہتے ہو کہ لوگوں کے خیالات کو بغیر انہیں رنجیدہ کئے تبدیل کر سکو تو اشاروں سے ان کو غلطیوں کی طرف توجہ دلاؤ

• اگر تم چاہتے ہو کہ لوگ تکلف و تصنع سے تمہارے ہم خیال ہو جائیں تو ایسا کرنے سے پہلے خود اپنی کمزوریاں تسلیم کر لو۔

• اگر تم چاہتے ہو کہ لوگ بہت جلد تمہارے ہم خیال ہو جائیں۔ تو اپنا مطلب دلکش انداز اور مؤثر پیرائے میں ان کے سامنے پیش کرو۔

• اگر تم جائز عیب بتا کر لوگوں کے خیالات تبدیل کرنا چاہتے ہو تو ان کی سچی قدردانی اور تعریف سے کلام شروع کرو۔

• اگر تم لوگوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہو تو ان کی کمزوریوں کو ہوا بنا کر ان کے سامنے پیش نہ کرو۔

• اگر تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہاری طرف راغب ہو جائیں اور زندگی میں کامیاب رہو۔ تو لوگوں سے ان کی دلچسپی کی باتیں کرو۔

• اگر تم لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانا چاہتے ہو تو دوسروں کی عزت کرو۔ اور ان سے کبھی براہ راست نہ کہو کہ تم غلطی پر ہو۔

مرسلہ

پہلی کوشش

طلباء میں مضامین لکھنے کا شوق پیدا کرنے کے لئے پہلی کوشش کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ یہ بہت اچھا خیال تھا نئے لکھنے والے آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رکھ سکیں (ادارہ)

علم و عمل

علم و عمل دو ایسی اصطلاحیں ہیں جو زندگی کی دو مخصوص شاہراہوں کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔ علم کے لغوی معنی ہیں جاننا۔ حقیقت پہچاننا اور اصلیت و ماہیت سے آگاہی حاصل کرنا۔ چیزوں کو صرف جان لینا کافی نہیں۔ بلکہ علم کا مفہوم آگاہی کا لامتناہی سلسلہ ہے۔ ان جانی ہوئی حقیقتوں کو مکمل و صورت سے آراستہ کرنا عمل کہلاتا ہے۔

انسانی زندگی ... جہد مسلسل، سعی پیہم اور شبانہ روز تگ و دو سے عبارت ہے۔ یہ ہر لمحہ ارتقائی منازل طے کرتی جارہی ہے۔ اس میں دم لینے کا یارا نہیں ہے

چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

اس کی مثال اس پانی کی طرح ہے جو رواں ہے تو مصفا و شفاف اور ٹھہر جائے تو متعفن و بدبودار بے عملی کی زندگی بھی آب ساکن کی مانند ہے۔ علم اور عمل میں وہی رشتہ ہے جو روح اور جسم کے مابین ہے۔ علم کو وجودی شکل دینا عمل کا فریضہ ہے۔ علم بغیر عمل کے غیر ہضم شدہ خوراک ہے جو کسی استعمال کی نہیں۔ غور کیا جائے تو دونوں لفظوں کی بناوٹ ہی دونوں کے تعلق پر دال ہے۔ دونوں ایک ہی جیسے تین حروف ابجد سے بنے ہیں۔ اور بڑے قلیل ردوبدل سے ایک سے دوسرا لفظ بنتا ہے۔ گو یہ تعلق صرف لفظی ہے مگر حقیقی لحاظ سے اہم بھی ہے۔

زندگی ان دونوں حقیقتوں کے گرد گھومتی ہے۔ آغاز زندگی سے اخیر زندگی دو ہی کیفیتیں ہیں۔ علم آغاز ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ بچہ جنم لے کر اس متحرک اور رواں دواں زندگی میں داخل ہوتا ہے۔ وہ اردگرد کی اشیاء کو پہچاننا اور جاننا شروع کر دیتا ہے۔ یہ علم ہے یہی علم اس کی عملی زندگی کی بنیاد ہے۔ اگر اسے یہ ابتدائی علم بھی حاصل نہ ہو پاتا تو زندگی میں قدم رکھنا کس قدر دشوار ہو جاتا۔

میل ملاپ زندگی نہیں بلکہ زندگی تو سکون ناآشنا ہوتی ہے۔ یہ بہاؤ ہے جس کی رو میں چلنے کے لئے ہر وقت مستعد رہنا چاہیئے۔ شعراء نے عناصر کی ترتیب پذیری کو زندگی اور ان کی بے ترتیبی کو موت سے تشبیہ دی ہے

عناصر کے باہمی اتحاد سے زندگی تخلیق ہوتی ہے۔ علم آگ ہے، تڑپ ہے، جذبہ ہے، جو عمل کے لئے اکساتا اور مقصد کی لگن کے لئے تڑپاتا ہے۔ کتابی علم بے فائدہ ہے جب تک عمل میں نہیں لایا جاتا۔

ہم صرف ظاہری حرکات و سکنات پر اکتفا کر کے مقصد حیات کے حصول میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ تگ و تاز اور مسلسل محنت و کوشش ہی سے زندگی کے کاروان کا ساتھ دیا جا سکتا ہے۔ گوتم بدھ نے کہا تھا جب میں زندگی میں آیا اور سانس لیا تو علم شروع ہوا اور جب چالیس سال سے گزرا تو عمل کی منزل میں آیا (ریاضت میں بھی چالیس سال کے بعد عمل شروع ہوا۔)

گویا زندگی کا بہت بڑا حصہ علم میں گزر جاتا ہے۔ یہ تکمیل جسم ہے مگر جب عمل کا دور شروع ہوا تو جسم میں روح آگئی۔ جب تک روح نہیں یہ مجسمہ کسی کام کا نہیں۔ وہی تو میں صفحہ طلسم جہاں پر قائم رہتی ہیں جو عمل کو اپناتی ہیں۔

گویا اپنے جسموں کو روح دیتی ہیں اور جو وقت کے دھارے کا ساتھ دیتی ہیں ورنہ زمانہ کب کسی کا انتظار کرتا ہے۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

زندگی ایک بحر ذخار ہے جس میں کشتی ڈال کر آرام سے نہیں بیٹھا جا سکتا۔ اس سمندر میں چھلانگ لگا کر ہاتھ پاؤں مارنے سے ہی چارہ ہے۔ جہاں ہاتھ پاؤں رکے میدان نے آلیا۔ علم مشکلات، مصائب اور تکلیفوں سے آگاہی ہے اور عمل ان سے بچانے کا ذریعہ۔ علم صرف یہ بتاتا ہے کہ زندگی کا ساتھ دینا ہے موجوں سے کشمکش عمل سے ہے۔

(جاوید کیانی سال دوم)

سید احمد قاسم زیدی، سال دوم

ایک خواب ایک خیال

اس روز چھٹی تھی اور میں گھر میں ہی کالج کے کام میں مصروف تھا۔ اچانک باہر سے آواز آئی۔ میں باہر گیا۔ دروازہ کھول کر جو دیکھا تو سامنے میرا عزیز ترین دوست اکرام کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اکرام تم! کہہ کر میں بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔ میری ساری تھکن دور ہو گئی۔ میں اسے اپنے ساتھ کمرے کے اندر لے آیا۔ اندر آتے ہی میں نے پوچھا

اکرام سناؤ بھئی کب آئے؟

صبح ڈبے پر آیا تھا اس نے مسکراتے ہوئے کہا

ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد میں والدہ کے بلانے کا کہہ کر چلا گیا۔ میں نے دروازے کے سوراخ سے جھانک کر دیکھا وہ بڑے ہی پیار سے ہولے ہولے میری کتابیں اور کاپیاں الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔

وہ کے۔ ای (سے۔ ۱۷) میڈیکل کالج کا سال دوم کا طالب علم۔ لائق اور ہونہار، سادہ و پر وقار۔ کبر و غرور

سے ناواقف بڑی ہی پیاری شخصیت کا مالک۔ مجھے اس پر ناز کیوں نہ ہوتا جبکہ میرا وہ بچپن کا دوست تھا۔

میں واپس آیا اس نے کالج کے بارے میں پوچھا۔ اساتذہ اور ہم جماعت دوستوں کے بارے میں پوچھا اور بھی طرح طرح کے بیسیوں سوال کر ڈالے۔ اس نے ہر ایک کا بڑی ہی خندہ پیشانی اور محبت سے جواب دیا۔

میں چائے لایا تو از خود وہ چائے بنانے میں مصروف ہو گیا اور میری ہر حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے وہ دن یاد آیا جب وہ چھٹی جماعت میں داخلہ لینے ہماری کلاس میں آیا اور جلد ہی میرا دوست بن گیا۔ پھر وہ وقت میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا جب آٹھویں جماعت میں ہم دونوں ڈرائنگ کے پیریڈ میں ایک ہی میز پر بیٹھ کر تصویریں بنایا کرتے تھے۔ پھر دسویں میں وہ مجھے بلیک بورڈ پر حساب کے سوالات نکالتا ہوا دکھائی دیا...

یہ سب کچھ ایک منٹ میں ہو گیا۔ اتنے میں اکرام چائے بنا چکا تھا میری طرف دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا اور بولا ارے تم افلاطون کے شاگرد کب بنے؟

جب ہم چائے پینے لگے تو اکرام نے بغیر کسی تمہید کے بتایا کہ وہ واپس لاہور جانا چاہتا ہے۔

آخر ایسی بھی کیا جلدی ہے ایک آدھ چھٹی ہی ڈلے لی ہوتی میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کوئی چھٹی وغیرہ لینا فضول ہوگا۔ کوئی ایسا بڑا کام تو تھا نہیں شام کو واپسی ہو گی۔ ٹھیک ہے صبح کالج حاضر ہو سکوں گا۔

ہم نے جلدی چائے پی لی اور ذرا سی دیر میں فارغ ہو کر اسٹیشن کی طرف چل دیئے۔ ڈبہ آنے میں پانچ یا چھ منٹ باقی تھے ٹکٹ وغیرہ لیا اور پھر باتوں میں لگ گئے۔

"لو بھئی ڈبہ تو آ بھی گیا" اس نے دور سے آتے ہوئے ڈبے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

سامان وغیرہ تو پاس تھا نہیں بے فکری سے کھڑے رہے۔ ڈبہ آیا کچھ مسافر اترے کچھ سوار ہوئے میرا دوست بھی سوار ہو گیا۔ ڈبہ چل دیا وہ دروازے میں کھڑا مسکرا مسکرا کر ہاتھ ہلاتا رہا۔ میں بھی اسے ہاتھ ہی کے اشارے سے الوداع کہہ رہا تھا۔

ڈبہ اسے لاہور کی گہما گہمیوں میں الجھنے کے لئے لے گیا۔ اور میں بوجھل دل کے ساتھ واپس لوٹ آیا۔ گھر پہنچا کچھ سوچتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا میری کتابیں اور کاپیاں اسی انداز میں میز پر بکھری پڑی تھیں۔ جیسے اس نے خود بکھیر کر رکھی تھیں۔ میں خیالات کی وادیوں میں نہ معلوم کہاں کہاں بھٹک

پھر رہا تھا کہ باہر سے کوئی سائیکل کی گھنٹی بجاتے ہوئے سڑک پر سے گزرا میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

آج پھر مجھے یاد آرہے ہیں میرا دوست تو چھ ماہ سے بھی زیادہ عرصہ ہوا اس دنیا میں مجھے تنہا چھوڑ گیا تھا روتے اور تڑپنے کے لئے! اور کتنے دنوں تک ہم اس کی یاد میں آنسو بہاتے رہے۔ یہ سوچتے ہی دو موٹے موٹے پیازی قطرے میری آنکھوں سے گرے۔ اور نیچے کھلی ہوئی کاپی کے سفید ورق پر چمکنے لگے۔ میرے دل کا دھواں میری آنکھوں سے ہو کر نکل آیا تھا۔ ان قطروں کے اندر ایک عجیب سی روشنی نمودار ہوئی — تلخ حقائق کا علم پا لینے کی روشنی اور مجھ پر ظاہر ہو گیا کہ یہ سب ایک خواب ہے ایک خیال ہے مگر اس کے ہمیشہ ہمیش کے لئے چلے جانے کا یقین نہ آتا تھا۔ اور اب بھی یوں لگتا ہے جیسے وہ لاہور ہی میں پھر رہا ہے اور چند دنوں تک یہاں آئے گا مجھ سے ملیگا۔ ہم باتیں کریں گے۔ مگر یہ سوچ کر دل بیٹھنے لگتا ہے کہ اب اس دنیا میں ہماری ملاقات کبھی نہیں ہو گی۔ وہ کیا خبر تھی کیا سے کیا ہو جائے گا۔

مجھ کو یہ آرزو کہ اٹھائیں نقاب خود
ان کو یہ انتظار تقاضہ کرے کوئی

(جگر)

المنار

المنار۔ عربی زبان کا لفظ ہے جو اردو میں بھی عام استعمال ہوتا ہے اس کا مصدر نورٌ ہے۔ نورٌ کے معنی ہیں الضَّوءُ یعنی روشنی۔ اسی سے نارٌ ہے۔ یعنی

جَوهَرٌ لَطِيفٌ مُضِيئٌ مُحْرِقٌ

یعنی ایک لطیف روشن جلانے والا جوہر

المنار کا مطلب ہے مَوضِعُ النُّورِ یعنی روشنی دینے والا مقام۔ اسی طرح اس کے دوسرے معنی ہیں

اَلعَلَمُ يُجعَلُ لِلاهتِدَاءِ فِي الطَّرِيقِ۔ یعنی وہ خاص نشان جو راستے پر راہ نمائی کے لئے لگایا جائے۔

اَلمنَارُ کی جمع مَنَائِرُ یا مَنَاوِرُ ہے

ہمارے رسالہ پر "روشنی اور رفعت کا نشان" کے الفاظ لکھے ہوتے ہیں کہ یہ المنار کا خاصہ ہے

رسالہ المنار تعلیم الاسلام کالج کے ہر طالب علم سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ بھی موضع النور بنے۔ اور اپنے اندر راہ نمائی کرنے کی صلاحیت پیدا کرے۔ چونکہ روشنی دینے والا مقام اور راہ نمائی کرنے والا نشان سطح زمین سے اونچا ہوتا ہے اس لئے المنار کے لفظ میں بھی رفعت اور بلندی کا مفہوم موجود ہے۔

(مرسلہ بشارت احمد کھوکھر سال اول)

طاہر شہزاد بی۔ اے فائنل

"ہمارا بھی شمار اب ہو چلا ہے جانے والوں میں"

ابھی کل کی بات ہے میں کالج میں داخل ہوا تھا۔ کالج کا تصور بہت دلچسپ تھا .... سنا کرتے تھے کالج کی فضا میں ایک آزادی ہوتی ہے ایک رومان ہوتا ہے اور ایک رنگینی ہوتی ہے .... میں نے ابتدا ہی سے کالج کی ہر قسم کی مصروفیات میں حصّہ لیا .... کھیل کے میدان میں بھی اور علمی سرگرمیوں میں بھی، دوستوں کو قریب سے دیکھا... جا بجا دوستوں سے صدمے اٹھائے .... ان کے لئے بے پناہ خلوص کا عملی مشاہدہ بھی کیا۔ اساتذہ کے دل میں طلباء سے ہمدردی و محبت کے سمندر موجزن دیکھے۔ طلباء کے دل میں اساتذہ کے لئے عزت و تکریم کے جذبات کا نظارہ دیکھا۔

ایک عجیب تاثر ہے جو میں نے کالج کے چار سال میں محسوس کیا، اس کا اظہار شاید میں کبھی بیان نہ کر سکوں ... پہلے روز جب میں کالج آیا تو اساتذہ کو دیکھا ... سادہ سادہ ... لیکن پُروقار گفتگو .... طرزِ عمل میں محبت ... برتاؤ میں سچائی ... احساس کی صداقت ... اتنے اوصاف کہ گنوائے نہیں جا سکتے سنا کرتے تھے کہ کالجوں میں ہنگامے بھی ہوتے ہیں .... ہڑتالیں ہوتی ہیں۔ طلباء کالج کا فرنیچر توڑ دیتے ہیں .... شیشے چکنا چور کر دیتے ہیں .... اور اساتذہ سے گستاخی کا سلوک کرتے ہیں۔ لیکن تعلیم الاسلام کالج میں میں نے یہ سب کچھ نہیں دیکھا

کافی عرصہ کی بات ہے کہ میں ایک دفعہ آل پاکستان مباحثات کے سلسلہ میں ریوہ سے باہر کسی کالج میں گیا ..... ایک صاحب مجھے کہنے لگے ... سنا ہے ٹی آئی کالج میں ہڑتالیں نہیں ہوتیں۔ میں نے کہا آپ نے درست سنا ہے ... ٹی۔ آئی کالج میں ایسی لغویات نہیں ہوتیں۔ کہنے لگے عجیب کالج ہے۔ میں نے کہا آپ کے خیال میں کالجوں میں ہڑتالیں ہونا بڑی اچھی بات ہے۔ فرمانے لگے ہاں بالکل ... میں نے کہا۔ انگریزوں کے زمانے میں لوگوں نے ہڑتالوں کا طریق اختیار کیا تھا۔ اب حکومت اپنی ہے۔ ہم ہڑتال کر کے اگر چیزوں کو توڑتے پھوڑتے ہیں۔ تو یہ ہماری حکومت کا نقصان ہے اور حکومت یہ نقصان خود ٹیکس لگا کر ہم سے ہی پورا کرتی ہے۔ ان صاحب کو اس بات کا جواب تو کوئی نہ آیا۔ بس کہنے لگے کہ ہڑتالوں کے بغیر

کالج لائف میں دلکشی نہیں رہتی ..... میں نے یہاں بہت ہی اعلیٰ روایات کا نظارہ دیکھا۔

حضرت مرزا ناصر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثالث ایدہ اللہ پرنسپل تھے جب میں یہاں داخل ہوا تو آپ ہوسٹل میں بہت کم تشریف لاتے تھے۔ لیکن قریب ہونے کی وجہ سے ذرا احساس نہ ہوتا تھا۔ آپ کی محبت و شفقت کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ تعلیم الاسلام کالج کی یہ بہت بڑی خوش نصیبی ہے کہ اسے آپ ایسا محبت کرنے والا وجود ملا۔ اور آپ کے بعد پھر مکرم قاضی محمد اسلم صاحب جیسا شفیق استاد۔

میں نے یہاں آکر گھر کا سا ماحول پایا۔ گھر سے اتنا دور ہونے کے باوجود کبھی احساس تک نہ ہوا کہ گھر سے باہر رہ رہے ہیں۔ اب جوں جوں یہاں سے جانے کے دن قریب آ رہے ہیں۔ دل میرا افسردگی بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں سے جانے کو بالکل جی نہیں چاہتا۔ لیکن کیا کیا جائے زندگی حرکت کا نام ہے۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا لیکن دل میرا یہیں رہے گا۔

چند دن جانے میں رہ گئے ہیں۔ وقت بڑی تیزی سے گزر رہا ہے۔ کاش وقت کی رفتار تھم جائے۔ لیکن ایسا شاید کبھی نہ ہوگا ؎

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انہی کی یاد میری زندگی ہے

میری ڈائری کا ایک ورق بقیہ ص ۵۵

پھول کھلتے ہیں مگر ان میں خوشبو نہیں ہوتی ..... دریا کے کنارے اب بھی ہمارے منتظر ہیں ..... جب سورج میں تمازت کم ہونے لگتی ہے تو وہ ہمارا انتظار کرتے ہیں۔ اور جب دن رات کے سیاہ دامن میں پناہ لے لیتا ہے۔ تو افسردہ ہو کر پرجوش لہروں کے تھپیڑے کھانے لگتے ہیں۔

ابھی کل کی ہی بات ہے کہ میں دریا پر گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر ہوا کے فرحت بخش جھونکے تھم سے گئے ..... اور مجھ سے پوچھنے لگے وہ تمہارا ساتھی کہاں ہے ..... میں نے ان کا سوال سن کر منہ پھیر لیا ..... کیونکہ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

آج میں اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا سوچ رہا ہوں ..... کہ وہ دن کتنے حسین تھے جو ہم نے اکٹھے گزارے ..... مجھے ایک ایک کرکے پرانے واقعات یاد آرہے ہیں۔ میں کچھ اور سوچنا نہیں چاہتا ..... میرا جی اکیلے میں گھبرا رہا ہے کیونکہ آج مارچ کی اٹھائیس تاریخ ہے۔ آج سے ٹھیک دو سال قبل تم یورپ گئے تھے ..... اور آج ..

ع

"گزرے ہوئے دن کچھ ایسے ہیں تنہائی جنہیں دہراتی ہے"

ایم لطیف گجراتی

"جدید طبیعیات" (Modern Physics) کی ابتداء

۱۲۰۰ ق م کے آریہ سائنس دان یہ جانتے تھے کہ مادہ چند نہایت سادہ اور بنیادی قسم کے عناصر سے معرضِ وجود میں آیا ہے۔ ۵۰۰ ق م کے ایک یونانی سائنس دان اور فلسفی Democritus کا خیال تھا کہ مادہ چار بنیادی عناصر مٹی - پانی - آگ اور ہوا کے ملنے سے بنا ہے - اور یہ چاروں عناصر لاتعداد چھوٹے چھوٹے ذرّات جن کو مزید چھوٹا نہیں کیا جا سکتا کے ملنے سے بنے ہیں - ان ذرّات کا نام اُس نے ایٹم رکھا تھا - ایٹم یونانی زبان میں ناقابلِ تقسیم ذرّے کو کہتے ہیں -

انیسویں صدی تک کے سائنس دان یہ تو جانتے تھے کہ مادہ ایٹموں سے معرضِ وجود میں آیا ہے لیکن انہیں خود ایٹم کی ساخت کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا - وہ ایٹم کو ابھی تک سادہ ترین اور ناقابلِ تقسیم ذرّہ سمجھتے تھے جس پر کسی قسم کا بار نہیں ہے ——— ایک برطانوی سائنسدان سر جے - جے ٹامسن نے اپنے تجربات کے دوران ایک ایسا چھوٹا سا ذرّہ دریافت کیا جو ایٹم سے ہزاروں گنا ہلکا تھا - اور منفی بار رکھتا تھا - اُس نے اس ذرّے کا نام الیکٹران رکھا اور اس کے بار اور کمیت کے درمیان نسبت بھی دریافت کر لی - بعد میں رابرٹ ملی کن ایک اور مشہور سائنسدان نے الیکٹران کے بار کی صحیح پیمائش بھی کی - اب سائنس دان اس ذرّے کے منبع کا سراغ لگانے لگے - وہ اس فیصلے پر پہنچے کہ منفی بار والا یہ ہلکا سا ذرّہ بے بار ایٹم کا ایک حصہ ہے - اس پر انہیں مزید یہ سوچنا پڑا کہ اگر ایٹم سے ہزاروں گنا ہلکا یہ ذرّہ ایٹم کا ہی ایک حصہ ہے تو یقیناً ایٹم کے کچھ اور بھی ترکیبی اجزاء ہوں گے پھر یہ کہ اگر یہ منفی بار والا ذرّہ ایٹم کا ہی ایک حصہ ہے تو یقیناً اس میں کچھ مثبت بار والے ذرّات بھی موجود ہونگے ورنہ ایٹم بے بار نہیں ہو سکتا .....

..... تو پھر ایٹم کے اندر کیا ہے ؟ .....

یہ سوال سب سائنس دانوں کے ذہن میں گونجا اور فوراً اس بظاہر حقیر سے ذرّے نے ساری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا - اور یہیں سے جدید طبعیات جسے ایٹمی طبعیات بھی کہتے ہیں کی ابتداء ہوئی - یہ بیسویں صدی کا آغاز تھا -

بہت سے سائنسدانوں نے اس موضوع پر سوچا اور نتیجۃً بہت سے نظریات پیش کئے گئے ان میں الیکٹران کے دریافت کنندہ سر جے جے کا "تربوز ماڈل" بہت مشہور ہوا - سر جے جے نے سوچا کہ الیکٹران تو ایٹم سے ہزاروں گنا ہلکا ہے اس لئے ایٹم کا اصل وزن دوسرے یعنی مثبت بار والے حصہ کی بدولت ہے - چنانچہ اُس نے نظریہ پیش کیا کہ ایٹم ایک تربوز کی مانند ہے جس کا گودا مثبت بار ہے اور الیکٹران اس میں اس طرح پڑے ہوئے ہیں جس طرح تربوز کے گودے میں بیج (شکل نمبر ۱) یہ خیال اس وقت بہت پسند کیا گیا - اور اُسے

"جے جے کا نظریۂ تربوز" کہا گیا۔ لیکن سائنس دان ایک نظریئے کو آزمائے بغیر مان لینے والے کب تھے۔ اُن کی جستجو مزید بڑھی اور وہ اس نظریئے کو کسی نہ کسی طرح تجربہ کی کسوٹی پر لا رکھنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔ جیگر اور مارسڈن دو مشہور سائنسدانوں نے سوچا کہ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ تربوز کے اندر کیا ہے ہم چاقو استعمال کرتے ہیں کیوں نہ ایٹم کے تربوز کو پھاڑنے کے لئے بھی کوئی "چاقو" ہی استعمال کیا جائے۔ لیکن اتنا چھوٹا چاقو کہاں سے آئے جو ایٹم کے اندر جا سکے؟ ..... بہرحال وہ اس چاقو کی تلاش میں لگ گئے۔

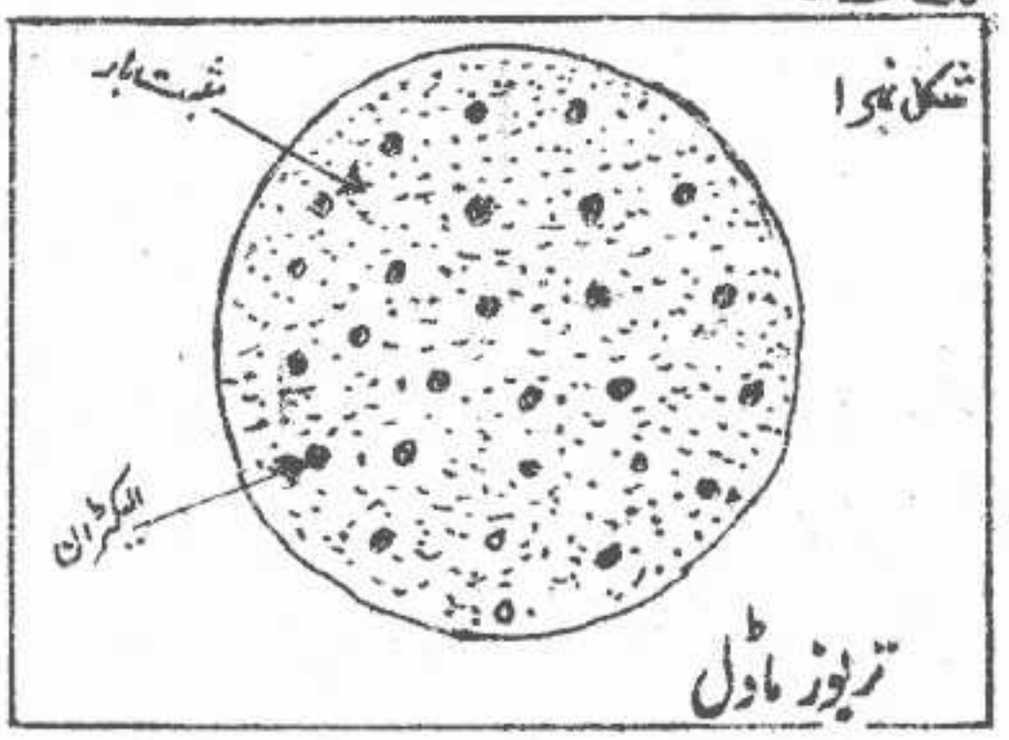

تابکاریت (Radioactivity)

بعض بھاری عناصر مثلاً یورانیم۔ ریڈیم اور تھوریم وغیرہ کے ایٹموں کی یہ خاصیت ہے کہ وہ ہر وقت توانائی کی خاص قسم کی شعاعیں خارج کرتے رہتے ہیں۔ یہ شعاعیں جیسا کہ بعد کی تحقیق نے ثابت کیا ہے ایٹم کے مرکزی حصّہ سے آتی ہیں۔ ان کے اخراج کی وجہ سے ان عناصر کے ایٹموں کی توانائی میں کمی آتی رہتی ہے۔ اور یہ نسبتاً ہلکے ایٹموں میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ان بھاری عناصر کی یہ خصوصیت فطری ہے اور اس کی کوئی وجہ دریافت نہیں ہو سکی۔ ان شعاعوں کی تفصیلی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ ان میں دراصل تین قسم کی اشعاع شامل ہیں :-

۱۔ الفا شعاعیں۔ تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ یہ شعاعیں مثبت بار رکھنے والے بھاری قسم کے ذرّات کا مجموعہ ہیں۔

۲۔ بیٹا شعاعیں۔ یہ صرف الیکٹرانوں کا مجموعہ ہیں۔

۳۔ گیما شعاعیں۔ یہ توانائی کی لہریں ہی ہیں جو الفا اور بیٹا شعاعوں کے اخراج کے وقت پیدا ہوتی ہیں۔

الفا شعاعوں کے ذرّات جنہیں الفا ذرّات بھی کہتے ہیں ان میں بہت توانائی ہوتی ہے اور یہ ایٹم کے اندر سے بہت تیز رفتار کے ساتھ نکلتے ہیں ایٹم کے تربوز کو چیرنے کے لئے سائنسدانوں کی نظر انتخاب الفا ذرّات پر پڑی اور انہوں نے انہیں چاقو کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ جیگر اور مارسڈن نے اُس وقت کے مشہور نیوزی لینڈ نژاد سائنسدان رادرفورڈ کی رہنمائی میں سونے کے ایٹموں پر الفا ذرّات پھینکنے کا تجربہ کیا۔ انہوں نے الفا ذرّات پھینکنے والا ایک عنصر ریڈیم ایک سٹینڈ پر رکھا۔ اُس کے سامنے سونے کی ایک باریک سی جھلّی کھڑی کی اور جھلّی کے پیچھے زنک سلفائیڈ لگا کاغذ کھڑا کر دیا (زنک سلفائیڈ کی یہ خصوصیت ہے کہ جب اُس پر الفا ذرّات پڑتے ہیں تو وہ روشنی کی شعاعیں دیتا ہے۔)

——— اس تجربے میں سائنسدانوں کو امید تھی کہ الفا ذرّات سونے کے ایٹموں میں سے بغیر کسی رکاوٹ کے سیدھے پار نکل جائیں گے۔ لیکن جو کچھ ہوا وہ اس کے برعکس تھا۔ ہوا یہ کہ بہت سی شعاعیں پار تو نکل گئیں لیکن انہوں نے جھلّی میں سے گذرتے وقت اپنے راستے کافی تبدیل کر لئے اور سیدھا جانے کی بجائے اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ اس پر مزید یہ کہ کچھ شعاعیں بالکل واپس مڑ گئیں ——— سائنسدانوں کے لئے

مشاہدہ قطعاً خلاف توقع تھا۔ کیونکہ اُن کے سامنے اس وقت تک سر جے جے کا ایٹم کا "تربوز ماڈل" تھا۔ جس کے مطابق ایٹم کا مثبت بار والا حصہ سارے ایٹم میں یکساں کثافت کے ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ اور اس میں کسی ایک جگہ اس قدر مثبت بار جمع شدہ نہیں ہو سکتا تھا کہ جو اتنے طاقتور الفا ذرات کو بھی واپس دھکیل دیتا۔ یا اُن کا راستہ ہی تبدیل کر سکتا۔

اس تجربے سے لارڈ ردرفورڈ اس نتیجے پر پہنچا کہ ایٹم کا مثبت بار والا حصہ سارے ایٹم میں پھیلا ہوا نہیں ہے بلکہ ایٹم کے درمیان میں ایک ہی جگہ جمع ہے اور اس طرح وہ مرکز جمع ہو کر اس قدر طاقت ور مثبت بار بن جاتا ہے کہ جو اتنی طاقت والے الفا ذرات کو بھی پرے دھکیل دیتا ہے۔ بہت سے سائنسدانوں نے اس خیال کی تائید کی اور سر جے جے کا "تربوز ماڈل" غلط قرار دے دیا گیا اور اس کی جگہ لارڈ ردر فورڈ کے نئے ماڈل نے لے لی۔ جس کے مطابق ایٹم کے دو ۲ حصے تھے۔

۱۔ مرکزہ (Nucleus)

۲۔ باہر والا حصہ (Extra-nuclear portion)

مرکزہ میں مثبت بار والا حصہ شامل ہے اور باہر والے حصے میں الیکٹران ہیں (شکل ۲)

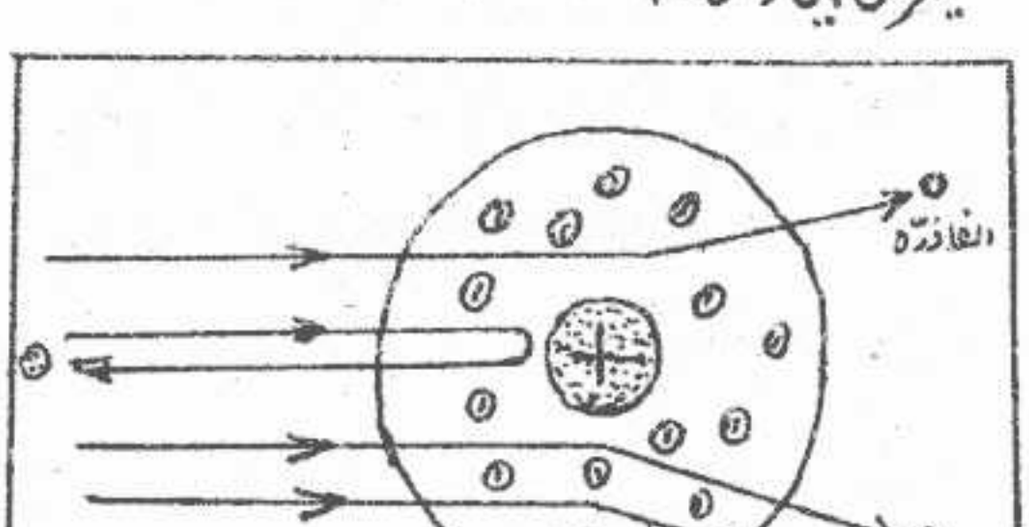

سوال ہوا کہ اگر مرکزہ میں مثبت بار موجود ہے اور باہر والے حصے میں الیکٹران موجود ہیں تو وہ منفی مثبت کی باہمی کشش کے تحت آپس میں مل کیوں نہیں جاتے؟ لارڈ ردرفورڈ نے جواب دیا کہ الیکٹران دراصل ایک جگہ ٹھہرے ہوئے نہیں ہیں بلکہ وہ مرکزہ کے گرد گردش کر رہے ہیں بالکل جس طرح سورج کے گرد زمین اور دوسرے سیارے گردش کرتے ہیں۔

اس ماڈل کو "لارڈ ردرفورڈ کا شمسی ماڈل" کہا جانے لگا۔ کیونکہ اس میں ایٹم کو نظام شمسی سے تشبیہ دی گئی تھی جس میں مرکزہ سورج اور الیکٹران سیاروں کے قائم مقام تھے۔

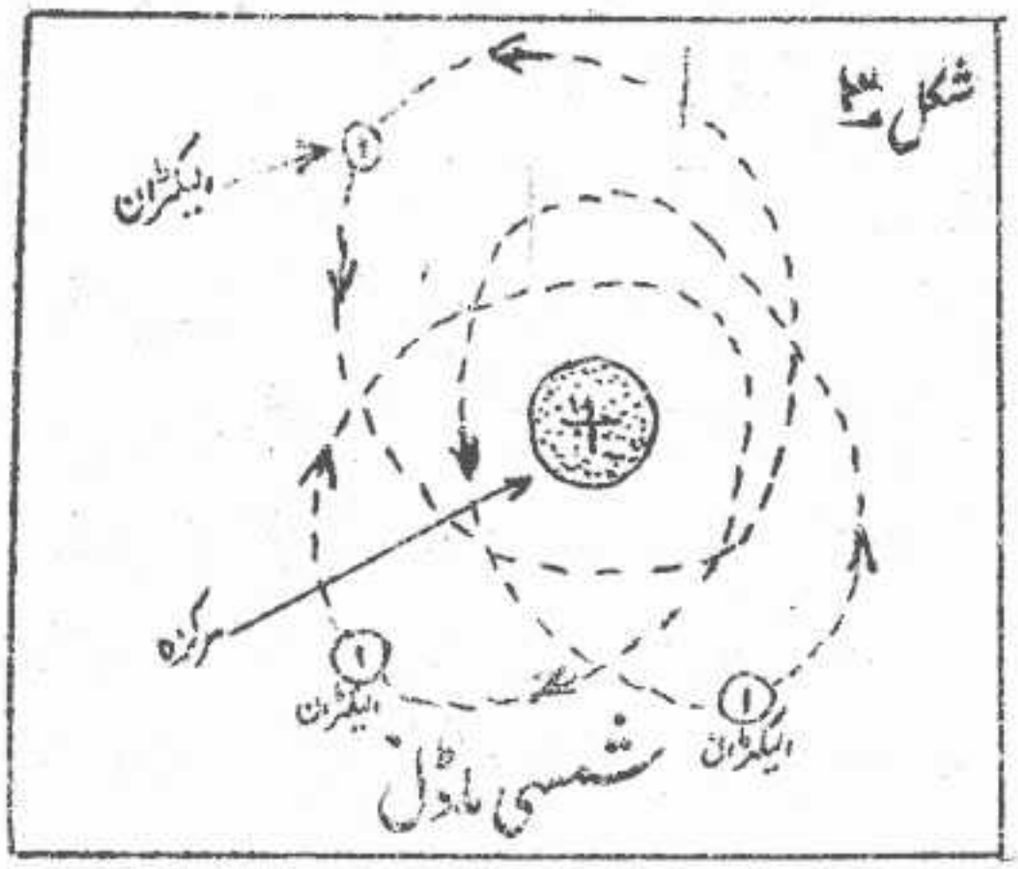

مانچسٹر یونیورسٹی میں جب ردرفورڈ "شمسی ماڈل" پر اپنے تاریخی تجربات میں مصروف تھا تو ڈنمارک کا ایک نوجوان سائنس دان نائلز بوہر (Niels Bohr) بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا بوہر بھی ایٹم پر تجربے کر رہا تھا اور وہ اس سلسلے میں ردرفورڈ کے ساتھ چند نظریاتی پہلوؤں پر بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ وہ ردرفورڈ کے شمسی ماڈل سے بہت متاثر ہوا لیکن اس کا کہنا تھا کہ مرکزہ کے گرد الیکٹرانوں کے گھومنے کو سورج کے گرد سیاروں کی گردش سے تشبیہ دینا سائنس کی زبان میں جائز نہیں کیونکہ

ٹ نظام شمسی کے سیارے بے بار ہیں جبکہ الیکٹرانوں پر بھاری منفی بار ہے۔

ٹ بجلی کے باب میں ہم پڑھتے ہیں کہ ہر متحرک بار برقی مقناطیسی لہریں (Electromagnetic Waves) خارج کرتا ہے اور اس قسم کی شعاعیں خارج کرنے کا لازمی نتیجہ شعاعیں خارج کرنے والے جسم کی توانائی میں کمی ہوتا ہے ——

چنانچہ اس لحاظ سے مرکزہ کے گرد گھومنے والے الیکٹرانوں کی توانائی آہستہ آہستہ ختم ہو جانی چاہیئے حتیٰ کہ وہ مرکزے میں جاگریں اور اس طرح ایٹم خود بخود ہی ختم ہو جائے! ——

بوہر نے حساب لگایا کہ ایٹم میں یہ عمل اتنی تیزی سے ہونا چاہیئے کہ سیکنڈ کے ایک کروڑویں حصے میں تمام الیکٹران مرکزہ میں جاگریں —— لیکن یہ ہمارے روزمرّہ کے مشاہدہ کے خلاف ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایٹم کبھی اس طرح خود بخود ختم نہیں ہوئے اور وہ مستقلاً قائم رہتے ہیں —— اور اس پر غور کرتا رہا اور آخر کار اس نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ "چونکہ فطرت کبھی غلط نہیں ہو سکتی اس لئے ضرور ہمارے وہ طبعیات کے اصول غلط ہیں جن پر اس نظریہ کی بنیاد ہے اور یا اگر ایسا بھی نہیں تو کم از کم ایٹم کے معاملے میں ہم نے ان اصولوں کو استعمال میں لا کر غلطی کی ہے" —— اور بوہر کا یہ سادہ سا بیان ایٹمی تحقیق کی تاریخ میں ایک سنگ میل ثابت ہوا۔

کسی چیز کو غلط قرار دے دینا تو آسان ہوتا ہے لیکن اس کی جگہ کوئی صحیح چیز پیش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ نائلز بوہر کے سامنے بھی یہی دقت تھی اور آخر کار اس مسئلے کا جو حل اُسے سوجھا وہ اتنا خلاف توقع، خلاف مشاہدہ اور عجیب و غریب تھا کہ خود اُسے بھی اس پر یقین نہیں آتا تھا۔ اور اس حل کا مسودہ پورے دو سال تک اس کی دراز میں پڑا رہا۔ آخر ۱۹۱۳ء میں اُس نے اُسے چھپوانے کیلئے بھیجنے کا فیصلہ کیا ——

اس حل میں بوہر نے میکانیات کے برسوں کے آزمودہ کلیوں اور قوانین کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا کہ ایٹم کے گرد گھومنے والے منفی ذرات (الیکٹران) کے معاملے میں مندرجہ ذیل قوانین کی پابندی کے سوا کوئی چارہ نہیں ورنہ ایٹمی تحقیق کی ساری کی ساری عمارت کے گر جانے کا اندیشہ ہے۔

۱ - مرکزہ کے گرد گھومتے وقت الیکٹران یونہی بلا ترتیب مداروں میں نہیں گھومتے بلکہ وہ صرف "چند خاص" مداروں میں گھوم سکتے ہیں اور ان "چند خاص" مداروں کا مرکزہ سے فاصلہ یا مقام معلوم کرنے کے لئے طبعیات کے عام قوانین ہمارے کام نہیں آ سکتے بلکہ اس مقصد کے لئے ہمیں کچھ خصوصی اصول و قواعد وضع کرنے پڑیں گے۔

۲ - جب تک الیکٹران ان "خاص الخاص" مداروں میں گھومتے ہیں وہ کسی قسم کی شعاعیں خارج نہیں کرتے۔ نتیجۃً ان کی توانائی میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس طرح ایٹم ثابت رہتا ہے۔

۳ - ان مداروں میں سے ہر ایک کی توانائی کی سطح الگ ہے۔ یعنی ایک مدار میں گھومنے والے الیکٹرانوں کی توانائی دوسرے مدار کے الیکٹرانوں سے مختلف ہے۔ اور توانائی میں یہ فرق ہر مدار کے مرکزہ سے فاصلے کی نسبت سے ہوتا ہے —— خاص حالات کے تحت الیکٹران ایک مدار سے دوسرے مدار میں چھلانگ لگا سکتے ہیں اس طرح دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں:——

(الف) یا تو الیکٹران زیادہ توانائی والے کسی مدار سے کم توانائی والے کسی مدار میں جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کی فالتو توانائی شعاعوں کی صورت میں خارج ہو جائے گی۔

(ب) اور یا الیکٹران کسی کم توانائی والے مدار سے کسی زیادہ توانائی والے مدار میں جاتا ہے۔ اس صورت میں کوئی شعاعیں خارج نہیں ہونگی۔ بلکہ اس صورت میں الیکٹران کو کچھ مزید توانائی درکار ہوگی۔ یہ مطلوبہ توانائی الیکٹران اس ذریعہ سے حاصل کرے گا جو اس کو دھکیلنے کا سبب بنتا ہے۔ مثلاً حرارت۔ بجلی کا شرارہ یا تیز رفتار طاقتور ذرات وغیرہ۔

بوہر نے ان نظریات کا اظہار بہت پس و پیش کے بعد کیا تھا۔ اور شروع میں ان پر کسی کو یقین بھی نہیں آتا تھا لیکن آہستہ آہستہ سائنسدانوں نے ان کو پرکھنا شروع کیا۔ اور انکی حیرت کی انتہا نہ رہی جب بوہر کے یہ بظاہر مہمل سے خیالات جو عام طبیعات کے بڑے بڑے آزمودہ قوانین کے صریحاً خلاف جاتے تھے لفظ بلفظ صحیح ثابت ہوئے۔ اور جوں جوں سائنسدان ایٹم کی تحقیق میں آگے بڑھ رہے ہیں ان خیالات کی صحت اور واضح ہوتی جارہی ہے۔ اور یہ تسلیم کرنا پڑ رہا ہے کہ ایٹم کی دنیا ہماری دنیا سے بھی انوکھی اور نرالی ہے جو وسعت میں بھی اس سے کسی طرح کم نہیں۔

شروع میں ایٹم کے اندر صرف دو قسم کے ذرات کا وجود مانا گیا۔ یعنی الیکٹران (منفی بار والے ذرات) اور پروٹون (مثبت بار والے ذرات) لیکن مزید تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ ایٹم میں ان کے علاوہ بھی کئی قسم کے ذرات موجود ہیں۔ اور اب تک جو تحقیق ہو چکی ہے اس کے مطابق ایٹم میں کم از کم بتیس (۳۲) قسم کے ذرات ہیں۔ ——— اور ابھی تو یہ جدید طبیعات کی صرف ابتداء ہے۔ ع

آگے آگے دیکھیئے ہوتا ہے کیا

دوست

دوستوں سے اس قدر صدمے اٹھائے جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گلا جاتا رہا

دکھ اٹھائے تو یہ معلوم ہوا
دوستی اک حسین دھوکہ ہے

تیر کھا کے جو دیکھا کمین گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

مرسلہ۔ خلیل الرحمٰن نمبر ۲
سال اول

طنز و مزاح

سید نعیم حیدر

"سویرے جو کل آنکھ میری کھُلی"

روزِ عید کی ہماہمی اور آمدِ مہمانان کی گہما گہمی سے فراغت ملی تو آغوشِ نیند کی رفاقت میسّر ہوئی۔ دوسرے روز خلافِ معمول صبح سویرے ہی آنکھ کھل گئی۔ بستر سے علیحدگی اختیار کی تو اُس نے فراقِ یار میں آنسو بہانا شروع کر دیئے۔ مگر کسی کو اس کی کیا پروا —— چپکے سے قدم باورچی خانہ کی طرف بڑھا دیئے کہ شاید کچھ کھانے کو ہی مل جائے۔ ابھی باورچی خانہ کے دروازہ ہی میں قدم رکھا تھا کہ مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی آواز نے کانوں میں رس گھولنا شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد معلوم ہو گیا کہ یہ مکھیوں کی بھنبھناہٹ نہیں بلکہ سرگوشیوں کی زبان میں کوئی اہم موضوع زیرِ بحث ہے۔ دل میں خیال ابھرا کہ صبح سویرے ہی یہ طرزِ گفتگو چہ معنی دارد —— اچانک نظر دائیں جانب صحن کی طرف اُٹھ گئی۔ کچھ عجیب سا منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ یقین نہ آیا آنکھوں کو بار بار ملا۔ دوبارہ اور پھر سہ بارہ صاف کیا۔ تنگ آ کر دوڑ کر چشمہ اٹھا لایا۔ مگر نظر پھر بھی وہی آیا جو پہلے دیکھا تھا۔ آخر کار آنکھوں پر یقین کرتے ہی بنی۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک حضرت لکڑیوں کا گٹھا سر پر اٹھائے مکان کے چھوٹے دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ پہلے تو خیال گذرا کہ چور ہے شور مچانا چاہیئے مگر جلد ہی پتہ چل گیا کہ میرا خیال غلط ہے۔ خیر تو وہ صاحب دروازہ سے باہر نکل کر مٹک مٹک کر قدم مار رہے تھے۔ مبادا کوئی بدتمیز خارِ راہ اُن کے مرمریں ننگے پیروں کے نازک تلووں کو چومنے کی کوشش نہ کر سکے۔ معاملہ میرے لئے پیچیدہ سا تھا۔ مَیں نے معاملہ کی تہ تک پہنچنے کے لئے از حد کوشش کی۔ بار بار سر پٹکا۔ آنکھوں دیکھے واقعات کی کڑیاں ملانے کی ناکام کوشش کی اور کچھ بھی سمجھ نہ پایا۔ میری تمام محنت رائیگاں اور بے سود ثابت ہوئی۔ آخر کار سوچا کسی سے پوچھ ہی لیا جائے۔ ابھی مَیں نے زبان ہلانے کی کوشش ہی کی تھی کہ ایک دُوربین نظر نے معاملہ کی نزاکت کو تاڑ لیا اور مکان کے ایک کونے سے آواز اُبھری ؎

بیسیوں یوم جس کا انتظار رہتا ہے
بڑی مشکل سے ملتا ہے وہ گوہرِ ناکارہ

بس اِسی سے تسلّی ہو گئی۔ گذشتہ کئی واقعات نے دماغ کی شاہراہوں پر فضائی مظاہرہ شروع کر دیا اور آج کے اِس واقعہ نے سالار کا کردار ادا کیا تو معلوم ہُوا کہ دوپہر کو کہیں دعوت ہے جو اس مقولہ کا ثبوت مہیا کرنے کے لئے ترتیب دی گئی ہے۔ " جس کا جوتا اُسی کا سر "

بقر عید تھی۔ بھیّا نے اپنی بساط کے مطابق ایک دُنبہ خدا کی راہ میں قربان کیا تھا جس میں سے حصّہ بقدرِ جثّہ کے مصداق ایک پوری ران آپ کے حصہ میں آئی تھی۔ معاً دماغ نے یلغار کی اور ایک عظیم الشان دعوت منصوبہ تیار کر لیا۔ ویسے بھی روٹھوں کو منانے کا بہت اچھا موقعہ ہاتھ آ گیا تھا۔ اب مشکل یہ درپیش تھی کہ ایک ران کے گوشت کو

کس طرح پورا کیا جائے یہ تو اونٹ کے منہ میں زیرہ بھی نہیں۔ چشم بصیرت کا غذی گھوڑوں پر سوار ہو کر اپنے پرانے سفر کی طرف مائل بہ پرواز ہوئی۔ نظر کے ساتھ ساتھ دل نے بھی ساتھ دیا۔ اور یک لخت پکار اٹھا ؎

گئی ہے نگہ پریشاں کہاں کہاں تیری

یعنی آپ کی حمد بجا لایا۔ اسی دم ایک مقام پر پہلا اسٹیشن آ گیا وہیں سے کچھ کام بنتا ہوا نظر آیا۔ بس پھر کیا تھا جھٹ سے بچگان کو انگلیاں پکڑ کر بھجوا دیا۔ ایک گھرانہ کو اس دعوت میں شریک ہونا تھا۔ ان کے مراسم سے انہیں گوشت آیا ہوا تھا انہی سے گوشت منگا لیا اور پھر انہی سے لکڑیاں بھی منگوا ڈالیں کہ اس دعوت کا کیا مزا جس میں ایندھن بھی اپنا جلانا پڑے۔ چاول بھی شاید ——— آپ خود ہی سمجھ گئے ہونگے لیجیئے دوپہر کو مانگے کا کھانا تیار تھا۔ ہر چیز بڑی بے تابی سے اپنے مالکان اور میزبان کے مہمانان کی منتظر تھی۔ اوہ! ایک بات تو میں بتلانا بھول ہی گیا۔ لیکن آپ تو پہلے ہی سمجھ گئے۔ اب بس کر دیجیئے۔ چھوڑیئے اس چیز کو . . . . ہاں تو خون کے گھونٹ پیتے ہوئے ہم نے روٹیوں کا آٹا اپنے ہی پاس سے بچا لیا تھا۔

مہمانوں کی آمد شروع ہوئی۔ گھر میں جگہ کی کمی کے باعث مہمانوں کا جمگھٹ عجب سماں پیدا کر رہا تھا۔ وہاں اس طرح معلوم ہوتا تھا جیسے کہ کوئی بہت اہم مقدمہ فیصل ہونے والا ہو جج صاحب کرسی پر براجمان ہیں۔ ملزم مایوسی اور امید کے ملے جلے جذبات لئے کٹہرے میں کھڑے ہیں۔ وکلاء پیچ و تاب کھاتے ہوئے ایک دوسرے کو گھور رہے ہیں۔ ملزم کے اعزہ جج کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے ہیں اور تماشائی خاموشی سے تماشہ دیکھنے میں محو ہیں۔

لیجئے آپ بھی مہمانوں سے متعارف ہو لیجیئے۔ سب سے پہلے میزبان کے والد محترم سے ملئے جن کے ساتھ اُن کی چھوٹی موٹی سی بیگم ایک ننھی منّی کلی کو سہارا دیئے ہوئے ہیں جس کے ساتھ ایک موٹی پھول لگا ہوا ہے اور جو نازِ اندام کے حمام سے سیراب ہو رہا ہے۔

مہمانوں کی ایک اور پارٹی آوارد ہوئی ہے۔ ایک طرف سے سورج کی کرنیں منعکس ہو کر آ رہی ہیں۔ میں نے سمجھا شاید کوئی شیشہ ہے۔ عینک لگا کر دیکھا نظر جو ٹھہری مگر وہ . . . . . تو معلوم ہوا کہ میزبان کے بھائی جان ہیں۔ آپ ایک طرف تشریف فرما ہوئے۔ آپ کے دونوں پہلوؤں میں دو اصنافِ نازک آ براجمان ہوئیں۔ ایک صنف نازک کم اور ایک ذرا زیادہ معلوم ہوا دونوں حرمین توسیلین ہیں۔ ایک حرمِ اولیٰ اور دوسری حرمِ ادنیٰ ——— مگر زمانے کی ستم ظریفی دیکھیئے کہ حرمِ ادنیٰ تو پھولی نہ سماتی تھیں اور حرمِ اولیٰ کی آنکھیں خاموشی کی زبان میں ایک کثیف اور پُر درد کہانی کہہ رہی تھیں۔ کیوں نہ ہوتا وہ حرمِ ادنیٰ کی طرح نوشہ میاں کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر بھی تو نہ کر سکی تھیں۔ نہ وہ کسی ذی روح کو گودِ مادری میں لے کر پروان چڑھا سکی تھیں۔ اور نہ دولہا میاں کی جائیداد کا کوئی وارث پیدا کر سکی تھیں جبکہ حرمِ ادنیٰ سے یہ چیز متوقع تھی۔ کیونکہ وارث نہ سہی وارثہ کو تو وہ اس دنیا سے روشناس کروانے کا شرف حاصل کر چکی تھیں۔

میں اس دن ایک دوست کے ہاں مدعو تھا۔ کھانا تو میں کھا آیا تھا مگر حقیقت بیان کرتا بھی وبالِ جان تھا کہ اماں کی مار . . . . . . ابا کی پکار . . . . . . گھر بھر کی جھڑکیوں . . . . . اور میزبان کی گھرکیوں کا ڈر تھا۔ کسی بہانہ کی تلاش میرا مقصود تھی

مذاق ہی میں ایک ایسی بات مُنہ سے نکل گئی جس کے نتیجہ میں آنکھوں کو میزبان کے چہرہ پر رونما ہونے والے جلال کی تاب لانا پڑی۔ مجھے بہانہ مل گیا تھا۔

کمرہ میں جاکر پلنگ پر صو رہا۔ سوتے میں کان میں آواز پڑی کہ کوئی شخص دہی لے آئے۔ معلوم ہوا کہ پہلے سیر کا دو سیر بنا ہوا دہی ختم ہوگیا ہے۔ آپ نے تھوڑا اس لئے منگوایا تھا کہ شاید کوئی دہی تھوڑا دیکھ کر غیرت میں آجائے اور نہ ہی کھائے یعنی جوش دلانے والی بات تھی مگر معاملہ اس کے اُلٹ ہوا تھا۔ وہ تو خیر گذری کہ دعوت کے دوران کوئی ہنگامہ نہ ہوا اور فضا پُرسکون رہی۔ یہ دعوت بخیر و خوبی تمام ہوئی۔ دعوت کے آخر میں میزبان اپنی خفّت مٹانے کی غرض سے اعلان کررہے تھے ؎

ملی نہیں ہے بازار سے ککڑی، مانگے کا گوشت ہے، مانگے کی مکڑی
مانگی گئیں چیزیں تھوڑی تھوڑی سی
نہ ہو گر یقیں تو مانگوں میں تکڑی!
ترازو

—●—

میں نے یونہی راکھ میں پھیری تھی انگلیاں
دیکھا جو غور سے تو تری تصویر بن گئی

(سلیم بے تاب)

اکرام سارے ان کی ہی دستار کے لئے
الزام سب ہمارے ہی سر پر اٹھا کریں

(سجاد باقر رضوی)

غرق آلودہ گردن زیر کاکل یوں دمکتی ہے
اندھیری رات ہے، برسات ہے، بجلی چمکتی ہے

(حاتم)

چمن میں پھر بہار آئی، گلوں پہ پھر نکھار آیا
مرے دل کو نہ کیوں یارب سکوں آیا قرار آیا
الٰہی تجھ سے میں شکوہ کروں بھی تو بتا کیونکر
مری قسمت کہ دامن میں نہ گُل آیا نہ خار آیا

(ہاشم صحرائی)

سید محمود سلیم

حادثہ

گاڑی پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھا ہوا کھڑکی سے باہر گھور رہا تھا۔ باہر بالکل اندھیرا گھپ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی زندگی بھی کتنی بے کیف ہے۔ ماں نہ باپ اور نہ ہی کوئی اور رشتہ دار۔ جب وہ اسٹیشن پر اترے گا تو اس کے استقبال کے لئے کوئی بھی تو نہیں آیا ہوگا۔ کتنے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کے عزیز و اقارب ان کو اسٹیشن سے لینے آتے ہیں۔ لیکن اس کا اس دنیا میں بھلا تھا ہی کون جو اسے لینے آتا؟ "میں بھی کتنا بے کس ہوں"! اس نے ہولے سے کہا اور پھر اٹھ کر اوپر "برتھ" پر چلا گیا۔ اس نے بستر بچھایا اور کپڑے تبدیل کئے بغیر لیٹ گیا۔ وہ سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن نیند اس سے کوسوں دور تھی۔

گاڑی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ آہستہ آہستہ وہ ماضی میں کھو گیا۔ ایک دن وہ بھی تھا جب وہ لاہور سے لندن کے لئے چلا تھا۔ کراچی تک کا سفر اس نے بذریعہ ٹرین کرنا تھا۔ اس دن اس کے ابا، امی اور نجمہ نے اسے سٹیشن سے الوداع کیا۔ اس دن وہ پریشان سا تھا۔ وہ اپنے والدین اور نجمہ سے پانچ سال کے لئے جدا ہو رہا تھا۔ اسے اس بات کی خوشی بھی تھی کہ جب وہ لندن سے واپس لوٹے گا تو ایک بہت بڑا آدمی ہوگا۔ اور پھر آتے ہی وہ نجمہ سے شادی کر لے گا۔ نجمہ نے بھی تو اس کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ مرتے دم تک اس کا انتظار کرے گی۔ اور پھر جب گاڑی اسٹیشن سے روانہ ہوئی تھی تو سب کی آنکھیں نم تھیں۔ اس نے کھڑکی سے نجمہ کو دیکھا اور ہاتھ ہلایا۔ نجمہ نے بھی آہستہ سے ہاتھ ہلایا۔

لندن پہنچنے کے ایک ماہ بعد اس کو اپنے شفیق باپ کی موت کی خبر ملی۔ یہ غم اس کے لئے کچھ کم نہ تھا ابھی اس کا یہ زخم بھرا نہیں تھا کہ ایک سال کے قلیل عرصہ میں اس کی ماں بھی عدم کو سدھار گئی۔ اس خبر نے تو اس کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ مصیبتیں اکیلی نہیں آیا کرتیں۔ لیکن وہ بے بس تھا۔ خدا کے کاموں میں بھلا انسان کیا دخل ہو سکتا ہے؟ اب تو لے دے کے اس کے پاس صرف نجمہ کی یاد ہی رہ گئی تھی۔ نجمہ کے خطوط اس کو برابر مل رہے تھے۔ جن سے صاف طور پر عیاں ہوتا تھا کہ وہ بڑی بے قراری سے اس کا انتظار کر رہی ہے۔

نجمہ اس کے چچا کی لڑکی تھی۔ اس کے والدین بچپن سے ہی فوت ہو گئے تھے اور اس نے اپنے تایا کے گھر میں ہی پرورش پائی تھی۔ ان دونوں کا بچپن اکٹھے گزرا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو بے حد چاہتے تھے اور یہ چاہت اب تک قائم تھی۔ بس ایک جان دو قالب تھے۔ لندن میں رہتے ہوئے اب اسے چار سال ہو گئے تھے۔ اب تو اسے منزل قریب نظر آ رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک سال کا یہ عرصہ ایک دن میں ختم ہو جائے اور وہ اڑ کر اپنی نجمہ کے پاس چلا جائے۔

مزید چھ ماہ پاکستان جانے کی امید میں گزر گئے اچانک نجمہ کے خطوط آنے بند ہو گئے اس کے لئے تو دنیا تاریک ہو گئی۔ اس نے کئی ایک خط لکھے اور پھر ایک دو تار بھی دیئے لیکن اسے سوائے مایوسی کے اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ اس کے لئے یہ ایک جان لیوا حادثہ تھا اور پھر اس نے فوراً ہی پاکستان جانے کی تیاری کر لی۔ وہ اتنی جلدی میں وہاں سے چلا کہ اس نے اپنی آمد کی اطلاع تک نہ دی۔ اور پھر اطلاع دیتا بھی تو کسے؟ نجمہ تو پہلے ہی خاموشی اختیار کر چکی تھی اس کو بھلا یہ کیسے امید ہو سکتی تھی کہ وہ اس کے آنے کی اطلاع پا کر اسٹیشن پر اسے لینے آ سکے گی۔ کراچی پہنچنے کے بعد لاہور تک کا سفر پھر ٹرین سے ہی کیا تھا اور آج وہ گاڑی میں بیٹھا اپنی گزشتہ یادوں کو لئے کراچی سے لاہور آ رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کتنی دیر سوچتا رہا کہ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔ وہ لاہور پہنچ گیا تھا۔ اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ اب کافی دھوپ نکل آئی تھی۔ اس نے جلدی سے سامان سمیٹا اور گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ اسٹیشن سے باہر آ کر اس نے ایک ٹیکسی لی اور ڈرائیور کو گلبرگ چلنے کو کہا۔ ٹیکسی فراٹے بھرتی لاہور کی مختلف صاف و شفاف سڑکوں پر چل رہی تھی۔ اور وہ دل میں لاکھوں وسوسے لئے سوچ رہا تھا کہ آیا نجمہ اس کو ملنے کوٹھی پر آئی گی یا نہیں؟ "وہ ضرور آئے گی"۔ اس نے دل کو تسلی دی۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹیکسی ایک کوٹھی کے سامنے رک گئی۔ اس نے کرایہ ادا کیا اور جلدی سے کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ اس کی نگاہیں نجمہ کو تلاش کر رہی تھیں۔

ڈرائینگ روم میں اسے ایک اجنبی نظر آیا۔ "آیئے اندر تشریف لے آیئے" اجنبی نے کہا اور پھر اس اجنبی کے ساتھ اندر ڈرائینگ روم میں چلا گیا۔ "آپ کی تعریف؟" اجنبی نے پوچھا۔ "جی مجھے راشد کہتے ہیں لیکن نجمہ کہاں ہے؟ وہ باہر کیوں نہیں آئی؟ اسے میرے آنے کی اطلاع دیجئے" وہ ایک سانس میں نجانے کیا کچھ کہہ گیا۔ کون نجمہ؟ یہاں تو کوئی نجمہ نہیں رہتی۔ آپ کس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ ہمیں تو کوئی علم نہیں کہ نجمہ کون ہے کہاں ہے اور ..... اور پھر اس سے آگے راشد کچھ نہ سن سکا۔ اس کو درو دیوار گھومتے ہوئے نظر آنے لگے۔ اس نے زور سے ایک قہقہہ لگایا۔ اور کوٹھی سے باہر نکل گیا۔ اور آج بھی وہ اس شہر کی سڑکوں پر نجمہ کا متلاشی ہے۔

محمد زکریا اولڈ سٹوڈنٹ

علطی

پنجاب ایکسپریس پر کافی ہجوم تھا باوجودیکہ گرمی کافی تھی۔ پھر بھی پلیٹ فارم لوگوں سے بھرا ہوا تھا لوگ آگے پیچھے بھاگ رہے تھے کچھ لوگ تو ایسے تھے جو سامان سمیت گاڑی کے ڈبوں میں چڑھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ یہ حالت زیادہ تر تیسرے درجے کے ڈبوں میں تھی۔ یہ اقراتفری عجیب قسم کا منظر پیش کر رہی تھی۔ میں دوسرے درجہ میں بیٹھا باہر کے منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس ڈبہ میں صرف نو آدمی تھے تین عورتیں جو غالباً تیس یا چالیس کے سن میں تھی۔ پچھلی دو نول نشستوں پر اس طرح قبضہ جمائے ہوئے تھیں کہ کچھ سامان اپنے ساتھ لئے بیٹھیں تھیں۔ کچھ 'برتھ' پر رکھا تھا۔ غرضیکہ چوتھا آدمی بمشکل وہاں بیٹھ سکتا تھا۔ میری نشست کے سامنے والی نشست پر ایک عمر رسیدہ شخص اپنے ساتھ دو نوعمر بچوں کو لئے بیٹھا تھا۔ بچے آس پاس کے ماحول سے بے خبر ہو کر اپنی شرارتوں میں محو تھے۔ میرے دائیں ہاتھ دو ہم عمر آدمی اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔

صبح تو بجکر بیس منٹ پر گاڑی نے رینگنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ پلیٹ فارم پیچھے ہٹتا گیا۔ کچھ لوگ گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے اور کچھ دوڑتے ہوئے جانے والوں کو آخری وقت پر بھی ہدایات دے رہے تھے اور کچھ ہاتھ ملانے کی غرض سے دوڑ رہے تھے۔

گاڑی کی رفتار تیز تر ہوتی چلی گئی۔ پلیٹ فارم نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اب گاڑی ربوہ کی مختصر آبادی سے بہت دور نکل آئی تھی۔ چناب کے پل کو گاڑی نے عبور کیا اور سرسبز علاقہ شروع ہو گیا۔

میں ایک مدت کے بعد کراچی جا رہا تھا۔ سفر چونکہ طویل تھا۔ اس لئے سفر کی کوفت سے بچنے کے لئے دو ناول اور ساحر لدھیانوی کا مجموعۂ کلام "تلخیاں" ساتھ لئے تھا۔ لیکن گاڑی سے باہر کا منظر ایسا حسین و لفریب تھا کہ جو پڑھتا تھا سمجھ نہ آتا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کچھ صفحے پڑھ کر کتاب رکھ دیتا اور باہر پیچھے بھاگتے ہوئے درختوں اور سبزے پر نظریں جمانے کی کوشش کرتا۔ ابھی تک میں ڈبہ کے ہمسفروں سے بے نیاز تھا۔ کسی سے بات نہ کی تھی اور نہ ہی کسی اور مسافر نے اس کی ضرورت محسوس کی۔ جب گاڑی رحیم یار خاں پہنچی۔ اس وقت دن ڈوب چکا تھا۔ سفر کی رات بڑی کٹھن ہوتی ہے۔ گاڑی اندھیرے کو چیرتی چیختی اور سکوت کو توڑتی تیزی سے منزل کی جانب دوڑ رہی تھی۔ کھڑکی میں سے

سر نکال کر جب میں نے آسمان کی جانب دیکھا تو بادل چھائے ہوئے تھے۔

رات کے ایک بجے گاڑی روہڑی اسٹیشن پر رکی۔ ہمارے ڈبہ سے دو مسافر اتر گئے۔ پھر کوئی پانچ منٹ بعد دروازہ کھلا۔ ایک بھاری بھرکم شخص ہاتھ میں ایک تھیلہ تھامے داخل ہوا اور اس کے پیچھے قلی کچھ سامان لے کر آیا۔ آنے والے شخص نے ڈبہ کا جائزہ لیا۔ وہ ابھی تک دروازہ سے چند قدم آگے کھڑا تھا۔ ڈبہ کل ۱۶ مسافروں کے لئے تھا مگر مسافر کچھ اس طرح لیٹے ہوئے تھے کہ یہ ان کے لئے بھی ناکافی ہو رہا تھا میں بھی اپنی نشست پر ڈبہ کی دیوار سے کمر لگائے پاؤں پسارے بیٹھا تھا۔ جب اس شخص کی نظر مجھ پر پڑی تو میں پاؤں سمیٹ کر سکڑ کے بیٹھ گیا وہ شخص "شکریہ" کہہ کر میرے ساتھ بیٹھ گیا۔

گاڑی پھر روانہ ہوئی — میں نے کھڑکی کھولی اور اندھیرے میں مستور سبزے اور درختوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ گاڑی کی رفتار تیز ہوئی تو سندھ کی ریت اندر آنے لگی۔ میں نے کھڑکی کو بند کر دیا۔ اور اپنے ہم پہلو نو وارد مسافر کو دیکھنے لگا۔ مسافر کھویا کھویا سا دکھائی دیتا تھا۔ میرے اور نئے مسافر کے سوا تمام مسافر سوئے ہوئے تھے۔ اس کا تھیلہ جو اس کے اور میرے درمیان تھا اس پر "سول ہسپتال حیدرآباد" لکھا تھا۔ جب میں نے اس کے کوٹ کی جیب میں صدر بین (Stethoscope) کا کچھ حصہ دیکھا تو پختہ یقین ہو گیا کہ یہ مسافر ڈاکٹر ہے۔ وہ ابھی تک چپ سادھے بیٹھا تھا۔ اس کی پریشانی کے نقوش پیشانی کے بلوں سے واضح تھے۔ جی چاہتا تھا کہ اس کے حالات معلوم کروں۔ آخر بڑی ہمت کر کے میں نے سلسلہ کلام شروع کیا۔

"جناب کی تعریف؟" اس نے میری جانب دیکھا اور یوں گویا ہوا

"مجھے وحید رضوی کہتے ہیں"۔

اس طرح ہمارا تعارف ہوا وہ پھر خاموش ہو گیا۔ میں نے پھر یوں بات کی۔

"معاف کیجئے آپ کچھ پریشان سے دکھائی دیتے ہیں"

"کوئی خاص بات نہیں جناب"! جواب ملا۔

"پھر بھی کچھ تو ہے" — میں نے بات بڑھائی۔

"مجھ سے کچھ حادثہ ہو گیا ہے۔ ہمارا کام ہی حادثات سے دوچار ہونا ہے۔ لیکن آج سے میں نے اس پیشہ کو ترک کر دینے کی قسم کھالی ہے۔ شاید اس طرح اپنی غلطی کی تلافی کر سکوں۔"

"غلطی" — ! میں نے ڈاکٹر کا لفظ دہرایا۔

"ہاں عظیم غلطی — جس کی تلافی شاید ناممکن ہے"

میں نے متجسس نگاہوں سے اس کو دیکھا اور اس نے اس پر مزید کہا۔

کل چار بجے میرے پاس ایک مریض لایا گیا۔ میں سلطان کوٹ میں ایک عزیز کو ملنے گیا ہوا تھا۔ روہڑی سے یہ مقام ۵۰ میل دور ہے۔ اچھی خاصی آبادی ہے۔ مریض نوجوان زخمی تھا۔ سندھ یونیورسٹی میں ایم۔ اے کا طالب علم تھا۔ رہنے والا سلطان کوٹ کا تھا۔ شکار کھیلتے ہوئے گولی اس کے سینہ میں لگی جو دائیں پھیپھڑے کو چیرتی ہوئی ریڑھ کی ہڈی میں تھوڑا پیچھے گوشت میں

پھنسی تھی۔ میں نے تحمل سے کام لیا اور آپریشن کرکے گولی نکال دی۔ خون کافی بہہ چکا تھا وہ چند گھڑیوں کا مہمان تھا۔ لمبا چوڑا خوبرو نوجوان میرے سامنے دم توڑنے والا تھا۔ مجھے بہت رنج ہوا۔ ابھی آپریشن کرکے باہر نہ نکلا تھا۔ نرس میرے ساتھ تھی۔ اچانک کسی نے زور سے دروازہ کھولا۔ ہم چونک پڑے اور حیرت سے آنے والے کو دیکھنے لگے۔ یہ اس کی نوجوان بیوی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور پاؤں میں جوتا بھی نہ تھا۔ دوپٹہ ہاتھوں میں تھا وہ ہمیں دیکھ کر ایک لمحہ ٹھٹکی۔ پھر اس نے مریض کی طرف دیکھا اور اس کے پاؤں پر سر رکھ کر رونے لگی۔ میں چند لمحے وہیں کھڑا رہا وہ اس کا نام "شاہد — شاہد" پکارتی اور روتی جاتی تھی۔ کبھی سر اٹھا لیتی اور مریض کو دیکھتی — میں نے مناسب خیال کیا کہ اس نو وارد کو اپنا غم ہلکا کر لینے دوں۔ چنانچہ میں اور نرس باہر آگئے — باہر آکر میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے خود اس نوجوان لڑکی کا خیال بار بار آرہا تھا۔ میرا دل بھر آیا۔

ابھی چند منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ مجھے کمرہ سے لڑکی کی دل خراش چیخ سنائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ شاید وہ چل دیا ہے۔ آہستہ سے میں نے دروازہ سے جھانک کر دیکھا۔ وہ مریض کے سینہ پر اپنا سر رکھے ہوئے تھی۔ میں نے اسے اٹھانا چاہا — لیکن جب میں نے اسے اٹھایا تو میرا دل منہ کو آگیا۔ میرے ہاتھ شل ہو گئے۔ لڑکی خون میں نہائی ہوئی تھی۔ اس دوران نرس بھی آچکی تھی۔ میں نے جیسے ہی پلٹا نرس دم بخود ہو کر گر پڑی — لڑکی کے دل پر آپریشن کا نشتر پیوست تھا۔ وہی نشتر اس نے اپنے دل میں گھونپ لیا تھا اور مریض کے ساتھ ہی جاں بحق ہو گئی تھی۔

میں بے اختیار ہو کر کانپنے لگا اور زمین پر شدت غم سے بیٹھ گیا۔ ایسی حالت میں آپریشن نشتر وہیں چھوڑ آنے کا مجھے سخت احساس تھا۔ دو نرالے مسافر چل دیئے تھے اور اپنے ساتھ میرا سکون بھی لے گئے تھے۔

میں اب واپس حیدرآباد استعفیٰ دینے جارہا ہوں اور اپنے پیشہ کو خیرباد کہہ دوں گا شاید اس غلطی کی تلافی ہو سکے۔

ڈاکٹر چپ ہو گیا۔ میرا دل پسیج گیا آنکھیں نم ہو گئیں میں نے ڈاکٹر کو دیکھا وہ منہ پھیرے رومال سے آنسو پونچھ رہا تھا۔ حیدرآباد آیا۔ اور ڈاکٹر اتر گیا۔

انسان کی عظمت کو ترازو میں نہ تولو
انسان تو ہر دور میں انمول رہا ہے

کتنی بے چین تھی اس رات مہک پھولوں کی
جیسے ماں جس کو ہو کھوئے ہوئے بچے کی تلاش

احمد ندیم قاسمی

خموش اے دل! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

اقبال

محمد سمیع طاہر بی۔اے فائنل

بہاریں پھر بھی آئیں گی

وادیٔ کشمیر کی گل پوش ڈھلانوں پر مہکتا سبزہ دور تک پھیلے لمبے لمبے درختوں کے سلسلے، اونچے نیچے پہاڑوں پر رنگا رنگ کے پھول، بلندی سے پستی کیطرف بہتے ہوئے ندی نالے اس کی روح میں جذب ہو کر رہ گئے۔

سرینگر کی فرحت بخش ہوا نے ماضی کے غم دور کر دیئے، یہاں کی زندگی سے لبریز راتوں نے اسے ایک نئی دنیا میں پہنچا دیا۔ وہ بھول گئی کہ اس کے والدین اس دنیا میں نہیں..... کچھ کشمیر کے دلفریب ماحول اور کچھ ندیم کی بے پایاں محبت کا اثر تھا کہ اس کے غم ہولے ہولے دل سے دور ہو گئے۔ وادی کی جنت نظیر سرزمین نے اس کے دل سے بمبئی کی سب یادیں چھین لیں..... جھیلوں اور چشموں کی اس سرزمین نے اس کا ماضی اسے فراموش کر دینے پر مجبور کر دیا۔

ہندوستان کے سیاسی افق پر تاریکی کے آثار نمایاں ہو چکے تھے، مسلمانوں کی ہمت اور شجاعت کا نشان.... پاکستان دنیا کے نقشے پر ابھرنے کو تیار تھا۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت وجود میں آنے والی تھی۔ بھارتی رہنماؤں کی دن رات کی کوششوں پر پانی پھر چکا تھا۔ محمد علی جناح نے ہر میدان میں بھارتی رہنماؤں کی سیاست کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ لیکن ریڈکلف ایوارڈ کی خونیں انگلیں کچھ کر گزرنے کو بے تاب تھیں۔

مسلمان آہستہ آہستہ پاکستان میں شامل ہونے والے علاقوں کی طرف منتقل ہو رہے تھے۔ یہی سوچ کر ندیم اپنی منہ بولی بہن کو بمبئی سے سرینگر آکر چھوڑ گیا تھا۔ ندیم اپنی بلوچ رجمنٹ کے ساتھ بھارت کے ایک دور دراز کونے میں برما کی سرحد کے ساتھ ایک چھوٹی سی چھاؤنی میں مقیم تھا.....

تین جون کی ایک خاموش شام تھی کیپٹن ندیم اپنی بیرک میں بیٹھا تھا، اچانک دروازہ کھلا اور شیر خان گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا..... صاحب ہندو ہمارے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں — حالات ہی کچھ ایسے تھے کسی پر اعتماد نہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ بھی گھبرا گیا..... اور کرنل کی بیرک کی طرف بڑی عجلت سے بڑھ گیا۔ کرنل احمد

خود ہی بیرک سے باہر نکل رہے تھے۔ انہوں نے رجمنٹ کو فالن ہونے کا حکم سنایا۔۔۔ جلد ہی پوری رجمنٹ کی ایک بٹالین کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی ہو گئی۔۔۔

پھر کرنل صاحب نے کیپٹن ندیم کو لائن سے باہر آنے کو کہا اور ذرا پرے لے جا کر کہا ـــ ندیم برطانوی سامراج ہندوستان سے جاتے ہوئے ایک نہایت اوچھا اور گھٹیا وار کرنے والا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ برصغیر میں کبھی امن قائم ہو سکے وہ کشمیر کو بھارت کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کر چکا ہے ـــ

ایک لمحہ کے لئے ندیم کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔۔۔۔ اسے ناہید کے والدین کی شہادت یاد آ گئی۔۔۔ وہ کالج گئی ہوئی تھی کہ ان کے محلہ پر غنڈوں نے حملہ کر دیا۔۔۔۔ ہندو بہادروں نے نہتے مسلمانوں کو بڑی بے رحمی سے تہ تیغ کر دیا۔۔۔ انہی شہید ہونے والوں میں ناہید کے ابا اور امی بھی تھے۔

ناہید جب کالج سے واپس آئی تو محلے پر مسلمان فوجی متعین تھے۔ ناہید نے جب جگہ جگہ لاشیں دیکھیں تو اس کے حواس سن ہو گئے۔ وہ جلدی جلدی اپنے گھر کے سامنے پہنچ گئی۔ سپاہیوں کے روکنے کے باوجود اپنے گھر میں داخل ہو گئی۔۔۔ لیکن اسے اچانک رکنا پڑا۔ پھر چکرا کر زمین پر گر پڑی۔۔۔۔

جب اسے ہوش آیا تو ایک مسلمان افسر اس کے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔۔۔ ناہید اسے ہندو سپاہی سمجھ بیٹھی۔۔۔۔ اس نے اس کا گریبان پکڑ کر چیخ کر کہنے لگی۔

اے ظالم درندو! تم نے میرے ابا اور امی کو قتل کر دیا ہے۔۔۔۔ مجھے کیوں زندہ رکھے ہوئے ہو۔ اے بے رحم انسان۔ میرے بیمار ابا نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔۔۔۔

جب اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہ آیا۔ تو اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔۔۔۔ نوجوان فوجی افسر کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے ـــ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔۔۔۔ اور پھر اس نے گریبان چھوڑ دیا۔

نوجوان افسر کہہ رہا تھا۔۔۔۔ معزز بہن!۔۔۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم دیر سے پہنچے اور تعداد میں بھی ان سے بہت کم تھے۔ لیکن ہم نے کسی غنڈے کو زندہ واپس نہیں جانے دیا۔ مجھے بہت دکھ ہے کہ ہم تمہارے کام نہ آ سکے۔۔۔۔ ہم بہت شرمندہ ہیں۔۔۔۔ کیپٹن ندیم کے ان الفاظ نے اسے سنبھلنے کا موقع دیا۔۔۔

اب وہ خاموش تھی۔۔۔ ندیم نے اس سے دیگر اقارب کے بارے میں پوچھا تو ناہید نے کہا۔۔۔ میرے ابا ایران سے یہاں آئے تھے۔۔۔ امی کے رشتہ دار بھی سب ایران ہی میں ہیں۔۔۔ یہاں ہمارا کوئی عزیز نہیں ہے۔۔۔ ہم یہاں مستقل طور پر آباد تھے۔۔۔ ندیم کچھ دیر تک اسے تسلی دیتا رہا۔۔۔ میں تمہیں جلد ہی اپنے والدین کے پاس کراچی چھوڑ آؤں گا۔۔۔ ناہید کو ندیم بہن کہہ چکا تھا۔۔۔ اس لئے اس نے بھی بھائی کی بات مان لی۔۔۔۔ اور پھر اسے کشمیر کی سیر کے لئے سرینگر لے آیا۔۔۔ یہ جگہ اسے اتنی پسند آئی کہ وہ ایک سال کے لئے یہیں رہ گئی۔۔۔۔ اور

ندیم کو ہندوستان کے دور دراز علاقے میں بھیج دیا گیا۔ ندیم کو کرنل احمد خاموش پا کر اس کی طرف بڑھے اور پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔۔۔۔ ندیم پھر ماضی کی وادیوں سے حال کی دنیا میں نکل آیا۔

کرنل صاحب کے حکم کے مطابق ندیم مسلمانوں کی ایک مختصر تعداد لے کر پاکستان کے مغربی حصہ کے لئے روانہ ہو گیا۔۔۔ ندیم جیپ میں بیٹھا تھا مگر تصورات میں وہ کشمیر کی روح پرور سرزمین میں داخل ہو چکا تھا۔۔۔۔ وادی کی رنگین یادیں اس کے دل میں ہلچل مچا رہی تھیں۔ اور وہ ان یادوں میں کھو کر رہ گیا۔

پھر اچانک اسے کشمیر کی محبوب سرزمین کی طرف بھارتی عفریت کا سیلاب بڑھتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ معصوم بچوں کی چیخوں اور بے بس عورتوں کی سسکیوں سے اس کی روح تک لرز گئی۔۔۔۔ اسے بمبئی کے فسادات یاد آنے لگے۔۔۔۔

پھر اسے کرنل صاحب کے کہے ہوئے الفاظ یاد آ گئے "ریڈکلف ایوارڈ کی خونیں انگلیاں کچھ کر گزرنے کو تیار ہیں۔ برطانوی سامراج جاتے ہوئے ایک اوچھا وار کرنے کو تیار ہے۔ وہ کشمیر کو بھارت کے حوالے کر دینے کا منصوبہ بنا چکا ہے"۔۔۔۔

ندیم نے آنکھیں بند کر لیں اور ہاتھوں سے کان کے پردے ڈھانپ لئے۔ اسے بے شمار سر تن سے جدا ہوتے دکھائی دینے لگے۔ بے بس عورتوں کی چیخوں سے اس کے کان کے پردے پھٹنے لگے۔۔۔۔

بوڑھوں کی بے حرمتی ہوتی ہوئی نظر آنے لگی۔۔۔۔ معصوم بچوں کے سر نیزوں سے اچھلنے لگے اور اس نے محسوس کیا۔ کہ عورتوں کی عزت اور حرمت کا احساس مٹ گیا ہے کمزوروں کی بے بسی کا خیال تک کرنے سے ذہن مفلوج ہو چکے ہیں۔۔۔

پھر اس نے خیال کیا۔ کشمیر کی جنت نظیر زمین اب وسیع قید خانہ بن گئی ہے۔ کشمیر کی فرحت بخش ہواؤں میں معصوم بچوں کی چیخوں اور عورتوں کی سسکیوں کی گونج کا زہر شامل ہو گیا ہے۔

ادھر ندیم تصورات کی دنیا میں الجھا ہوا تھا۔ ادھر سرینگر میں ناہید بے خوفی سے ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو چکی تھی۔ ہوسٹل خالی ہو چکا تھا۔ تمام لڑکیاں اپنے اپنے گھروں کو جا چکی تھیں۔۔۔۔

بھارت سے دھڑا دھڑ لشکر سے وادی میں داخل ہو رہے تھے کشمیر کے نہتے ان کا مقابلہ بھلا کیا کرتے۔ لیکن ان کا خون کھول رہا تھا۔ ساری وادی میں آزادی پر مر مٹنے کا عزم تھا۔ کشمیر کی مردم خیز سرزمین کے بہادر سپوتوں نے غلامی کی بجائے عزت کی موت قبول کر لی تھی۔ مجاہدین کے چھوٹے چھوٹے لشکر آ رہے تھے۔ شہادت کی آرزو انہیں دور دراز سے یہاں کھینچ کر لا رہی تھی۔

ہوسٹل کی عمارت میں ناہید اداس بیٹھی تھی۔ ہوسٹل کی وسیع و عریض عمارت اسے کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ سپرنٹنڈنٹ بھی اپنے گاؤں چلی گئی تھی۔۔۔۔ لڑکیاں تو کبھی کی ہوسٹل سے جا چکی تھیں۔۔۔۔ صرف ناہید

تھی جو تنہا رہ گئی تھی ۔۔ اس کا اس دنیا میں سوائے ندیم کے اور کوئی نہ تھا ۔۔ اور ندیم جو اس سے سینکڑوں میل دور تھا

بہت دن ہوئے اسے ندیم کا خط ملا تھا وہ خط آج پھر اس کے سامنے پڑا تھا۔ لکھا تھا۔

ناہید!

سدا خوش رہو!

میں تم سے بہت دور ہوں ..... کشمیر کی وادی مجھ سے بہت دور ہے ... میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنی بہن کے ہمیشہ قریب رہوں .... ہندوستان میں افراتفری کا عالم ہے ... دعا کرو ... کہ حالات جلد ٹھیک ہو جائیں ..... اور پاکستان میں آزادی اور سکھ کا سانس لیں۔ اور خدا کرے کہ پاکستان ہماری آرزوؤں اور امیدوں کا سورج بن کر طلوع ہو .... میں موسم بہار میں تمہیں ملنے آؤں گا ... جب کشمیر حقیقی معنوں میں کشمیر بنا ہو گا۔

تمہارا بھائی ۔۔ ندیم

لیکن ۔۔ یہ بہار ۔۔ خوشیوں کی بجائے آہوں اور سسکیوں کو اپنے جلو میں لے کر آئی تھی ۔۔ اسے اپنے والدین یاد آنے لگے ۔۔ جو بمبئی میں غنڈوں کے ظلم و استبداد کا شکار ہو گئے تھے اور اگر اس وقت ندیم نہ آجاتا تو پتہ نہیں خود اس کا کیا حال ہوتا۔ ۔۔ ندیم اس کے لئے رحمت کا فرشتہ بن کر آیا ۔۔ اور بھائی کا پیار بھی اسے ندیم کے روپ میں مل گیا۔ پتہ نہیں ندیم کس حال میں ہے ۔۔ شاید اب وہ یہاں آ بھی سکے گا کہ نہیں ..... پھر اسے خیال آیا پتہ نہیں وہ زندہ بھی ہے کہ نہیں۔ کیونکہ جنگ کے دنوں میں کسی بھی سپاہی کی جان کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ یہ سوچ کر اس کا دل دھڑکنے لگا پھر وہ سوچنے لگی ۔۔ ندیم نے آنے کا وعدہ کیا تھا وہ ضرور آئے گا .... وہ ایک بہت بڑا لشکر لے کر آئے گا اور ان درندوں کو کشمیر سے نکال باہر کرے گا۔ اور کشمیر کی جھیلیں پھر صاف اور شفاف پانی سے لبریز ہو جائیں گی۔ باد نسیم کے جھونکوں میں آہوں اور سسکیوں کی پرسوز داستان ختم ہو جائے گی۔ فضا میں نغمے بکھر جائیں گے۔ پھر کشمیر کی بہاروں سے لطف اندوز ہونے لوگ یہاں آیا کریں گے اور پھر وہ ندیم کے ساتھ کراچی چلی جائے گی اور ندیم کی امی اور ابا کو امی اور ابا کہہ کر پکارے گی۔ اور ندیم کے چھوٹے بھائی کو پیار کرے گی۔ تو وہ معصوم چہرہ اٹھا کر اسے باجی کہہ کر پکارے گا ..... انہی خیالات کو سوچتے سوچتے رات بیت گئی۔ پھر بہت سے دن گزر گئے .... بہار آگئی اور گزر گئی .... درختوں کے پتے زرد ہو گئے .. ہوا میں خنکی شامل ہو گئی۔ اور سرد اور تند ہوائیں چلنے لگیں۔ مگر ندیم نہ آیا ...

ایک دن ناہید نے آزاد کشمیر ریڈیو آن کیا تو اناؤنسر اعزاز پانے والوں کے ناموں کا اعلان کر رہا تھا ..... اکثر انعام پانے والے شہید ہو چکے تھے۔ اچانک ناہید کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو گئیں اور وہ چکرا کر گر پڑی ....

وقت گزرتا گیا .... ہوسٹل پھر آباد ہو گئی ...

کشمیر کا بڑا حصہ بھارت کے قبضہ میں آ گیا تھا ......
انجمن اقوام متحدہ خاموش تھی ...... اور کشمیریوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی ..... پھر کئی بہاریں آئیں۔ مگر ندیم نہ آیا۔ ناہید سوچتی۔ بہاریں پھر بھی آتی رہیں گی ــــ مگر کوئی ایسی بہار نہ آئے گی جب ندیم آئے گا ــــ

ــــ (بقیہ پگڈنڈیاں صفحہ ۵۸) ــــ
سائیکل کی رفتار بھی کچھ کم نہ تھی ۔ سائیکل سوار دور جا گرا ۔ اس کے بازو سے تیزی سے خون بہنے لگا ..... بہت سے راہ گیر اسے دیکھنے کے لئے رک گئے ۔ سائیکل سوار کو بازو پر شدید چوٹ آئی تھی ...... وہ تکلیف سے بلبلا اٹھا تھا ۔ ایک آدمی نے اسے بازو سے تھام لیا ۔ میں نے جلدی سے اپنا رومال نکال کر اسے دیا ...... لیکن اتنے بڑے زخم کے لئے وہ ناکافی تھا ..... جس شخص نے بازو تھاما ہوا تھا اس نے لوگوں سے کہا ۔ اگر کسی کے پاس اور رومال ہو تو دیا جائے ۔ لیکن عجیب بات کہ کسی نے اس بات کا نوٹس لینے کی جرأت نہ کی ۔ شائد اس لئے کہ وہ سب افسر لوگ تھے ..... اعلیٰ قسم کے کپڑے ان کے جسموں پہ چمٹے ہوئے تھے ۔ لیکن ان کے دل انسانی ہمدردی سے خالی تھے ...... وہ ابھی متردد تھے کہ ایک دیہاتی نے اپنی میلی کچیلی قمیص اتار کر پیش کر دی تھی ...... میں نے غور سے اس کے بعد کئی چہرے دیکھے ان کے سر جھکے ہوئے تھے ۔

...... اور چہروں پر ندامت کے آثار تھے ...... اس وقت میں نے سوچا یہ دیہاتی انسان ہے جس میں انسانیت کا جذبہ موجود ہے ...... اور دوسرے کیا وہ بھی انسان ہیں ؟ طاہر شہزاد

انسانی ہمدردی :-

میں ربوہ سے گوجرانوالہ کے لئے روانہ ہوا جب بس چنیوٹ پہنچی تو ایک تھانیدار صاحب اپنے چار سپاہیوں سمیت بس میں داخل ہوئے کلینڈر نے اگلی دو سیٹیں فوراً خالی کر دائیں اور مسافروں کو بھی مجبوراً خالی کرنی پڑیں ورنہ مرتا کیا نہ کرتا ۔

انہیں مسافروں میں سے ایک انتہائی ضعیف اور بیمار آدمی تھا اور اسے کہیں درد ہو رہا تھا اور وہ مارے درد کے کراہ رہا تھا ۔ لیکن اسے سیٹ سے اٹھا کر بس کے فرش پر بٹھا دیا گیا ۔ اور وہاں اس کی حالت دیکھ کر انسان کو رونا آتا تھا لیکن سب لوگ خاموش تھے ۔ میرے دل میں فوراً انسانی ہمدردی کا جذبہ امڈ آیا ۔ اور میں اپنی سیٹ سے اٹھ بیٹھا اور اس بوڑھے کو سیٹ پر بٹھا دیا اور میں گوجرانوالہ تک کھڑا ہو کر گیا ۔ سب لوگ میری طرف حیرت اور رشک کی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور میرا سر فخر سے بلند ہو رہا تھا ۔

محمد اسلام ایف اے سال اول

محمود خالد بی۔اے فائنل

معاہدہ علاقائی تعاون برائے ترقی

"علاقائی تعاون برائے ترقی" کی تنظیم ۲۱ جولائی ۱۹۶۴ء کو عالم وجود میں آئی۔ جب ایران ترکی اور پاکستان کے سربراہوں نے استنبول میں اپنے اجلاسوں میں ایک اعلیٰ سطح کا معاہدہ کیا اس میں یہ اعلان کیا گیا کہ

"ایران۔ ترکی اور پاکستان کے مابین معاشی تعاون کے ذریعہ باہمی تجارت کو ترقی دینے کے لئے موثر طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔ کیونکہ علاقائی تجارت کا فروغ نہ صرف بنفسہ ایک اچھا مقصد ہے بلکہ اس سے مزید علاقائی ترقی اور اتحاد کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔"

آر۔سی۔ڈی کے معرض وجود میں آنے کی چند وجوہات ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں

۱۔ تاریخی وجہ اگر پاکستان۔ ایران اور ترکی کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ماضی میں بھی ان تینوں ممالک کے درمیان انتہائی قریبی اور برادرانہ تعلقات رہے ہیں اس کے علاوہ ان تینوں ممالک کے رہنے والے لوگ مسلمان ہیں اور یہاں کے لوگوں کی ثقافت اور مذہب ایک ہے۔ ان قریبی تعلقات کی وجہ سے ان ممالک کے درمیان آر۔سی۔ڈی کا قیام عمل میں آیا۔

۲۔ معاشی وجہ آر۔سی۔ڈی کے معرض وجود میں آنے کی دوسری معاشی وجہ تھی۔ ایران۔ ترکی اور پاکستان تینوں ملک معاشی لحاظ سے پسماندہ تھے اور تینوں غریب ملک تھے۔ ان تینوں ممالک کی مشکلات ایک تھیں۔ ان پر بیرونی ممالک کی پابندیاں تھیں۔ تو ان ممالک کے لیڈروں نے ان مشکلات کو حل کرنے کے لئے آر۔سی۔ڈی کی شکل میں تعاون کیا۔

۳۔ علاقائی اتحاد علاقائی تعاون برائے ترقی کا معاہدہ کرنے میں یہ بات بھی معاون ثابت ہوئی ان تینوں غریب اور پسماندہ ممالک کی سرحدات ایک دوسرے ملک سے ملتی تھیں اور ان میں کسی قسم کا جھگڑا نہ تھا اور کسی بھی غیر ملک کا علاقہ ان ممالک کے درمیان نہ آتا تھا۔ اس لئے یہ ممالک بہترین رنگ میں ایک دوسرے سے تعاون کر سکتے تھے۔ تو علاقائی اتحاد کی وجہ سے آر۔سی۔ڈی

ہ معاہدہ کرنے میں آسانی پیدا ہوئی۔

۴۔ ان ممالک کے مدبرین نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمارے پاس ہر قسم کے وسائل موجود ہیں تو کیوں نہ ہم ان وسائل سے بہتر رنگ میں فائدہ حاصل کرنے کے لئے یورپی مشترکہ منڈیوں کی طرز پر ایک تنظیم بنا ڈالیں اور اپنے تمام وسائل کو یکجا کر کے ان سے بہتر رنگ میں فائدہ اٹھائیں تو ان وجوہات کی بنا پر ۲۱ جولائی ۱۹۶۴ء کو آر۔سی۔ڈی کا قیام عمل میں آیا۔

اغراض ومقاصد:۔

علاقائی تعاون برائے ترقی کا معاہدہ کرنے کے چند اغراض ومقاصد تھے جو مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ آزادانہ تجارت۔ اس معاہدے کا پہلا مقصد یہ تھا کہ تینوں ممالک کے درمیان تجارت آزادانہ ہو یعنی اس پر کسی قسم کی پابندیاں نہ ہوں اور ایک ملک سے تاجر آسانی سے اپنا مال دوسرے ملک میں بھیج سکیں

۲۔ قریبی اتحاد و یگانگت۔ اس معاہدے کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ ان ممالک کے درمیان انتہائی قریبی یگانگت ہو۔ کسی مسئلہ پر بھی ان ممالک کے درمیان اختلاف نہ ہو۔ اور یہ تینوں ممالک ایک دوسرے کے شانہ بشانہ ترقی کر سکیں۔

۳۔ مشترکہ منصوبہ جات:۔ آر۔سی۔ڈی کا معاہدہ کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ تینوں ممالک ایک دوسرے کی مدد کریں اور ان منصوبہ جات کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں جو مشترکہ تعاون سے تیار کئے جائیں۔ اور پھر ان سے فوائد حاصل کریں۔

۴۔ معاہدہ میں یہ بھی طے پایا کہ تینوں ممالک کے درمیان محکمہ ڈاک کی ٹکٹ مساوی ہو۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ڈاک جس شرح سے اندرون ملک بھیجی ہے۔ اسی قیمت پر ان تینوں ممالک میں بھی ڈاک بھیجی جا سکے۔

۵۔ ہوائی سروس:۔ معاہدہ میں اس بات پر بھی اتفاق ہوا کہ تینوں ممالک کی ہوائی سروس کو بہتر کیا جائے اور تینوں ملکوں کے ہوائی جہاز دوسرے ملکوں میں جایا کریں۔ اور لوگ آسانی سے ایک ملک سے دوسرے ملک آیا اور جایا کریں۔ اور ان میں برادرانہ جذبات پیدا ہوں۔

۶۔ اس معاہدہ میں یہ بھی طے پایا کہ تینوں ممالک کی جہاز سازی کی صنعت کو متحد کیا جائے۔

۷۔ تینوں ملکوں کا اس بات پر بھی اتفاق ہوا۔ کہ تینوں ملکوں کے درمیان ویزا سسٹم کو ختم کیا جائے۔ تاکہ لوگ بغیر کسی روکاوٹ کے ایک ملک سے دوسرے ملک جا سکیں۔ اس مقصد کے لئے تینوں ملکوں کو ریلوے اور سڑکوں کے ذریعہ ملا دیا جائے۔

۸۔ سیر و سیاحت کو بڑھایا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے لوگوں کو خاص سہولتیں دی جائیں اور تینوں ملکوں میں معلومات کے دفتر قائم کئے جائیں۔ جہاں سے لوگ ہر قسم کی معلومات حاصل کر سکیں۔

۹۔ تینوں ملکوں کے درمیان ٹیکنیکل ماہرین کا تبادلہ کیا جائے۔

کارہائے نمایاں :-

۴ فروری ۱۹۶۶ء کو وزراء کی کونسل کا ایک اجلاس اسلام آباد میں ہوا جس میں صدر پاکستان نے فرمایا کہ یہ تنظیم (آر سی ڈی) اس علاقے کے لوگوں میں باہمی اقتصادی اور ثقافتی تعاون پیدا کرنے کے لئے ایک نہایت قابل قدر عملی بنیاد مہیا کرتی ہے۔

اس اجلاس کی کارروائی سے پتہ چلتا ہے کہ تینوں ممالک کے درمیان صنعتی تجارتی، مواصلاتی اور ثقافتی میدانوں میں باہمی اتحاد و تعاون مضبوط بنانے کے سلسلہ میں کامیابیاں حاصل کر لی گئیں ہیں۔

۱۔ **ذرائع حمل و نقل**: تینوں ملکوں نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ تینوں ممالک کے درمیان ([illegible]) ہوائی جہاز کی سروس میں قریبی تعاون پیدا کیا جائے۔ تو اس منصوبہ کے مطابق تینوں ملکوں کے ہوائی جہاز ایک دوسرے کے ملک میں آنے جانے لگے۔ اور اس سلسلے میں دفاتر بھی قائم کئے گئے۔

۲۔ **آر سی ڈی شپ سروس کا قیام**: تینوں ملکوں نے مل کر ایک آر سی ڈی شپ سروس قائم کر لی۔ اس کارپوریشن میں ۱۵ فیصد حصہ ایران کا ۵۰ فیصد حصہ پاکستان کا تھا اور باقی ۳۵ ترکی کا حصہ تھا اس کارپوریشن کا کام یہ ہے کہ تینوں ملکوں کے درمیان اور دوسرے غیر ممالک سے درآمدات و برآمدات لانے اور لے جانے کا کام کرے گی۔ اور اس طرح بہت سا زرمبادلہ بھی بچایا جانے لگا۔

۳۔ **ریل اور سڑکیں**: یہ بھی پروگرام تھا کہ تینوں ملکوں کو ریل اور سڑکوں کے ذریعہ ملا دیا جاوے۔ تو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ایک سڑک کراچی سے لے کر استنبول تک تعمیر کی گئی۔

۴۔ **ذرائع رسل و رسائل**: تینوں ملکوں میں معاہدے کے مطابق ڈاک کے ٹکٹ اور لفافے کی قیمت اندرون ملک کی قیمتوں کے برابر مقرر کر دی گئی۔ اس مقصد کے لئے پاکستان میں Teewani اور Rad gasht کے مقامات پر پوسٹ اور ٹیلیگراف آفس قائم کئے گئے۔ اور ایران میں Katur اور Sozoo کے مقامات پر پوسٹ اور ٹیلیگراف آفس قائم کئے گئے۔ اور اس طرح آپس میں تعاون کیا گیا۔

۵۔ **سیر و سیاحت**: سیر و سیاحت کو ترقی دینے کے لئے ویزا ختم کر دیا گیا۔ تاکہ لوگ آسانی سے ایک ملک سے دوسرے ملک جا سکیں اور اس مقصد کے لئے لوگوں کو خاص سہولیات فراہم کی گئیں۔ ان کے لئے انفارمیشن آفس قائم کئے۔

۶۔ **بنکنگ اور انشورنس**: اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کراچی میں ایک سنٹر انشورنس آر سی ڈی بنام سے ستمبر ۱۹۶۵ء میں قائم کیا گیا۔ اس کے علاوہ یہ سنٹر علیحدہ علیحدہ بھی تینوں ممالک میں قائم کئے گئے ہیں۔ ان سنٹروں نے بچتیں بڑھانے میں بہت کام کیا ہے۔

۷۔ فنی تعاون۔ یہ بھی طے پا گیا تھا کہ ہر سال تینوں ممالک کے طالب علم دوسرے ملک میں جا کر فنی تعلیم حاصل کیا کریں گے۔ اس کے مطابق ایران اور ترکی کے بہت سے طالب علم پاکستان میں آ کر فنی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ خاندانی منصوبہ بندی میں تعاون کیا گیا ہے۔

۸۔ صنعتی منصوبوں میں تعاون:۔ معاہدہ کرتے وقت اس بات پر بھی اتفاق ہوا تھا کہ صنعتی طور پر بھی مشترکہ منصوبہ جات قائم کئے جائیں اور اس وقت جو منصوبہ جات علاوہ آمد کے لئے مدنظر تھے ان کی تعداد ۱۹ تھی۔ اور یہ ایسے منصوبہ جات تھے جن میں تعاون ہو سکتا تھا۔ مگر بعد میں ان کی تعداد ۲۸ کر دی گئی ہے اور یہ بھی طے پایا کہ تینوں ممالک اپنی ضروریات کی تمام اشیا اپنی ممالک سے خریدیں گے تو اس معاہدے کے تحت ۳ منصوبے شروع کئے گئے ہیں۔ ایک کارخانہ ایلومینیم کاربن کا ایران میں قائم کیا جائے گا۔ اور دوسرا کارخانہ ٹیوب بنانے کا ہوگا جو پاکستان میں قائم ہوگا۔

۹۔ تجارت میں تعاون:۔ تجارت میں ترقی دینے کا ایک ادارہ قائم کیا۔ تاکہ تینوں ممالک کے درمیان تجارت کو وسعت دی جائے۔ اسی طرح ایک یونین قائم کی گئی۔ جس میں زر مبادلہ رکھا گیا۔ تاکہ اگر کسی ملک کو زر مبادلہ کی ضرورت محسوس ہو تو اس ضرورت کو پورا کیا جائے۔ یا اگر کسی غیر ملک کو زر مبادلہ دینا پڑے۔ تو آسانی کے ساتھ اور جلدی سے زر مبادلہ ادا کر دیا جائے اور اس یونین کا نام R.C.D payment union. رکھا گیا۔

۱۰۔ ثقافتی تعاون۔ معاہدہ میں یہ بھی طے کیا گیا تھا کہ تینوں ممالک ثقافتی میدان میں بھی تعاون کریں گے اور اس مقصد کے لئے تینوں ممالک ایک دوسرے کے ہاں ثقافتی وفود بھیجتے رہا کریں گے۔ تو اس مقصد کے لئے ایک ثقافتی ادارہ "مہران" قائم کیا گیا اسی طرح تینوں ملکوں کے سکالر دوسرے ممالک کے ہاں جائیں گے۔ اسی طرح دو کتابیں چھاپی جائیں گی۔ جن میں ان تینوں ملکوں کی ثقافتی تاریخ مرتب کی جائے گی۔

آر۔سی۔ڈی کا مستقبل:۔

آر۔سی۔ڈی کا معاہدہ تینوں ملکوں کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور ہم اس پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اور اگر اس معاہدہ کے لائحہ عمل کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ معاہدہ تینوں ملکوں کی اقتصادی ترقی کے لئے ایک جامع اور مکمل لائحہ عمل ہے۔ اور اس وقت تک یعنی چار سال کے مختصر سے عرصہ میں اس منصوبہ نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں ان کو دیکھ کر ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ آر۔سی۔ڈی کا مستقبل نہایت روشن ہوگا۔ اور تینوں ملکوں کی اقتصادی ترقی میں ایک سنہری باب کا اضافہ کرے گا۔

اللہ تعالےٰ کے فضل سے پاکستان ایران ترکی

کے پاس ہر قسم کے وسائل موجود ہیں۔ جن کی اس معاہدہ کے منصوبہ جات میں ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اور ہم ان وسائل کو یکجا کر کے بہترین رنگ میں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

آر۔ سی۔ ڈی کے معاہدہ میں ابھی تک صرف تین ملک ہی شامل ہیں اور ان ممالک کی خواہش ہے کہ اس معاہدہ میں اور بھی ممالک شامل ہو جائیں اور اس معاہدہ کو وسعت حاصل ہو۔ مگر اس معاہدہ میں شرکت کے لئے ایک شرط ہے کہ اس ملک اور ان ممالک کے درمیان کسی قسم کا اختلاف نہ ہو۔ اور کوئی بھی ان ممالک میں جھگڑا نہ ہو۔ مگر ہم امید کر سکتے ہیں کہ بہت ملک اس معاہدہ کے کارنامے دیکھ کر اس معاہدہ میں شامل ہو جائیں گے۔ اور اس معاہدہ کو وسعت حاصل ہوگی۔ اور ہم امید کر سکتے ہیں کہ مستقبل قریب میں ایسے فوائد حاصل ہوں گے۔ جن کی بدولت تینوں ملک ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہو سکیں گے اور ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کر سکیں گے۔ بیرونی امداد پر بھی انحصار کم ہو جائے گا۔ اور ہر قسم کی ضروریات کی چیزیں یہ ممالک خود ہی پیدا کر سکیں گے۔ اور اشیاء کو برآمد کر کے کثیر زرمبادلہ حاصل کریں گے۔

شعروشاعری

۱۔ شاعر دکھوں سے سیکھتے ہیں اور گیتوں سے سکھاتے ہیں۔ (شیلے)

۲۔ شاعر لکھنے کے لئے اس وقت تک قلم اپنے ہاتھ میں نہیں اٹھاتا۔ جب تک اس کی سیاہی محبت کی آہوں سے شرابور نہیں ہو جاتی (شیکسپیئر)

۳۔ تاریخ کی نسبت شاعری حقیقت کے زیادہ قریب ہے (افلاطون)

۴۔ شاعری، سکھی اور اعلیٰ انسانوں کے اعلیٰ اور سکھ بھرے لمحوں کا اظہار ہے (شیلے)

۵۔ شاعر وہ سپیرا ہے جس کی پٹاری میں سانپوں کی بجائے دل بند ہوتے ہیں۔ (پریم چند)

۶۔ شاعری کا عظیم مقصد لوگوں کی فکر دل کو دور کرنا اور ان کے خیالات کو وسعت دینا ہے۔ (کیٹس)

مرسلہ۔ فضل احمد شاہد سال اول)

ٹھہرو کہ ہمیں بھی اسی منزل پہ ہے جانا
ٹھہرو کہ بہت دور رہے جاتے ہیں ہم لوگ

(نسیم سیفی)

پگڈنڈیاں

(اس کالم میں ایسے واقعات کا تذکرہ ہوتا ہے جو طبائع انسانی پر اثر انداز ہوتے ہیں)

غفلت :-

ریاض کبھی میرا دوست تھا۔ ہم سکول میں ایک ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔ بہت دنوں کی بات ہے ہم بازار جا رہے تھے کہ ریاض ایک دکان پر چاقو خریدنے کے لئے ٹھہر گیا۔ دوکاندار نے ہمیں کئی چاقو دکھانے دوکان پر کچھ اور گاہک بھی آ گئے۔ دکاندار ان کی طرف متوجہ ہوا تو اس دوران ریاض نے ایک چاقو چھپا لیا۔ اور بعد میں زیادہ قیمتوں کا بہانہ کر کے چلتا بنا۔ میں بھی اس کے ساتھ چل پڑا۔ گھر پہنچنے پر اس نے یہ چاقو اپنی ماں کو دکھایا اور کہا کہ چاقو مجھے سڑک پر پڑا ملا ہے۔ میں نے بتا دیا کہ خالہ جان ریاض نے چوری کیا ہے۔

خالہ جان نے معمولی سی سرزنش کی۔ ریاض چونکہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور پیار محبت نے کچھ اس پر زیادہ ہی اثر کیا تھا۔ اس لئے ریاض نے ماں کی اس ڈانٹ کو بھی کوئی خاص اہمیت نہ دی۔

ہم نئی جماعتیں بدلتے رہے۔ پھر ہمارے سکول بھی مختلف ہو گئے۔ وہ کسی اور شہر چلا گیا۔۔۔

دو سال ہوئے میں نے سنا کہ ریاض کراچی میں ڈاکوؤں کی جماعت کے ساتھ مل کر پولیس کے ہاتھوں شدید زخمی ہوا ہے۔ اس کی ٹانگ میں گولی لگی اور بعد میں وہ ٹانگ کٹوانا پڑی۔ اب اگرچہ وہ رہا ہو کر گھر آ گیا ہے۔ لیکن وہ کام کاج کرنے کے قابل نہیں رہا۔۔۔

جب میں نے یہ خبر سنی تو ریاض کا وہ واقعہ فوراً میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ میں سوچنے لگا کہ کتنی مائیں لاڈ اور پیار کی بدولت یا بچہ سمجھ کر نظر انداز کر جاتی ہیں جن کے کندھوں پر تمام قوم کا بار ہوتا ہے وہ قوم کی پرورش کے وقت اتنی غفلت کیوں برتتی ہیں۔ اگر وہ اس وقت ریاض کو سختی سے ڈانٹتی اور آئندہ اس کا خیال رکھتی تو شاید آج انہیں خون کے آنسو نہ بہانے پڑتے :: ملک احمد نواز بی۔ اے فائنل

انسان :-

دوپہر کے سائے پچھم کی طرف جھک چکے تھے ۔۔۔ ہوائیں سورج کی تمازت دم توڑ چکی تھی۔ کھاریاں شہر چھاؤنی کو ملانے والی سڑک پر بہت رش تھا۔ سائیکل اور تانگے تیزی سے آ جا رہے تھے۔ اچانک ایک سائیکل سوار ایک تانگے کے پائیدان سے ٹکرا گیا۔ تانگہ بہت تیزی سے جا رہا تھا اور وہ

(باقی دیکھیں صفحہ ۹۸ پر)

محمد شریف صاحب خالد
ایم۔اے۔ ایل ایل۔بی

اللہ تعالیٰ

ہے پیارا بہت نام اللہ تعالے
بناتا ہے سب کام اللہ تعالے

مری زندگی کا وہی ہے سہارا
ہے آغاز و انجام اللہ تعالے

بجھاتا ہے سب تشنگی روح کی
ہے میخانہ و جام اللہ تعالے

جدھر دیکھتا ہوں جہاں دیکھتا ہوں
وہیں جلوہ آرام اللہ تعالے

جلاتا ہے مردے بھگاتا ہے ظلمت
مٹاتا ہے آلام اللہ تعالے

وہ اول وہ آخر وہ ظاہر وہ باطن
ہے قیوم و قسام اللہ تعالے

ہے اللہ بس اور باقی ہوس
کہ خالد ہے نام اللہ تعالے

غزل

حضرت اکمل (۱۸۸۱-۱۹۶۶ء)

سلسلہ احمدیہ کے مشہور صحافی اور شاعر حضرت قاضی محمد ظہور الدین صاحب اکمل رضؓ کے کلام نغمۂ اکمل سے یہ نظم لی گئی ہے۔

اے عندلیب پھول رہی ہے تو پھول پر
ہم تجھ کو اپنا پھول کسی دن دکھائیں گے

پہلے کہیں سے جا کے جگر تھامنا تو سیکھ
پھر اپنی داستان تجھے ہم سنائیں گے

سینے کے زخم سینے کی حاجت تو درکنار
ان پر نمک چھڑک کے مزے ہم اڑائیں گے

جس پر کبھی زوال کی راتیں نہ آتی ہوں
اس چودھویں کے چاند سے ہم دل لگائیں گے

مشتاق دید دیدہ و دل فرش راہ ہیں
یارب ہمارے پاس وہ کس وقت آئیں گے

پھر آگیا بہار پہ موسم بہار کا
زخم جگر کو کھول کے ہم گل کھلائیں گے

جاتی ہے جاں تو جائے یہ پروا نہیں ہمیں
جو قول کر چکے ہیں اسے ہم نبھائیں گے

یہ سر ہے اپنا اور ترا سنگ آستاں
اٹھ جائیں گے جہاں سے نہ اس کو اٹھائیں گے

غزل

حضرت اکمل (۱۸۸۱-۱۹۶۶ء)

سلسلہ احمدیہ کے مشہور صحافی اور شاعر حضرت قاضی محمد ظہور الدین صاحب اکمل رضی اللہ عنہ کے کلام نغمۂ اکمل سے یہ نظم لی گئی ہے۔

اے عندلیب پھول رہی ہے تو پھول پھول
ہم تجھ کو اپنا پھول کسی دن دکھائیں گے

پہلے کہیں سے جا کے جگر تھامنا تو سیکھ
پھر اپنی داستان تجھے ہم سنائیں گے

سینے کے زخم سینے کی حاجت تو درکنار
ان پر نمک چھڑک کے مزے ہم اڑائیں گے

جس پر کبھی زوال کی راتیں نہ آتی ہوں
اس چودھویں کے چاند سے ہم دل لگائیں گے

مشتاق دید دیدہ و دل فرش راہ ہیں
یارب ہمارے پاس وہ کس وقت آئیں گے

پھر آگیا بہار پہ موسم بہار کا
زخم جگر کو کھول کے ہم گل کھلائیں گے

جاتی ہے جاں تو جائے یہ پروا نہیں ہمیں
جو قول کر چکے ہیں اسے ہم نبھائیں گے

یہ سر ہے اپنا اور ترا سنگ آستاں
اٹھ جائیں گے جہاں سے نہ اس کو اٹھائیں گے

مکرم مصلح الدین صاحب راجیکی مرحوم

مجبوری

کس قدر مجبور ہوں میں گردشِ تقدیر سے
کس قدر معذور ہوں میں آہِ آتشگیر سے

کاش ہوتا دم کوئی دردِ نہاں کے واسطے
چارہ گر ہوتا کوئی اہلِ فغاں کے واسطے

آسماں کا دل ہجومِ بے بسی پر کانپتا
جوہرِ غربت میں حالِ زار کو پہچانتا

"شمع" رک جاتی یہاں پروانہ کے آزار سے
"پھول" بھونروں کو چھڑا لیتے غمِ دلدار سے

"چاند" سن لیتا کبھی کبابِ دری کا ماجرا
بے اثر ہوتی نہ یوں "پی پی" پپیہے کی صدا

بے محابا قیس آتا حسن کی سرکار میں
کوہ کن کو یار ملتا محفلِ دلدار میں

مُصلحِ ناچیز ہوتا جانِ جاں کے سامنے
بے نوا کی بات بنتی مہرباں کے سامنے

رحم کے آثار لیکن اس جہاں سے دُور ہیں
جلوۂ محبوب سے خالی یہاں کے طُور ہیں

چوہدری محمد علی صاحب ایم-اے

غزل

رات پھر آئی امتحاں کی طرح
بن بلائے۔ بلائے جاں کی طرح

کس کی خوشبو قفس میں پھیل گئی
کون گزرا ہے گلستاں کی طرح

آرزوئیں کھڑی ہیں رستوں پر
دم بخود۔ گرد کارواں کی طرح

گھورتی ہیں روش روش آنکھیں
نقش پائے گزشتگاں کی طرح

جل رہے ہیں چراغ چہروں کے
اشک در اشک کہکشاں کی طرح

تیر اُس کا خطا نہیں ہوتا
ہم نے ڈالی نئی فغاں کی طرح

ان کو دیکھا تو دیکھتے ہی رہے
لُٹ گیا دل بھی نقدِ جاں کی طرح

ہم کسی کو بُرا نہیں کہتے
اپنے یارانِ مہرباں کی طرح

ذرّہ ذرّہ ہے درد کا محرم
ذرّہ ذرہ ہے رازداں کی طرح

اشک برسے تو اس قدر برسے
دُھل گئے دل بھی آسماں کی طرح

آگے قسمت مری نصیب مرے
تُم تو آؤ سرورِ جاں کی طرح

غمِ جاں کا بھی احترام کرو
غمِ جاناں۔ غمِ جہاں کی طرح

غمِ جاناں ایک شورشِ گمنام
کسی مجذوب کے بیاں کی طرح

غمِ جاں کے ہزارہا چہرے
غمِ جاناں حسنِ لامکاں کی طرح

عمر بھر ہم رہا کئے مضطرؔ
اپنے گھر میں بھی میہماں کی طرح

ڈاکٹر چوہدری ناصر احمد پرواز
ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی

غزل

دل مبتلا ہے اک وفا ناآشنا کے ساتھ
کیسی گرہ لگی ہے ہوا کی ہوا کے ساتھ

مہکا ہوا ہے صبح سے آنگن خیال کا!
آئی ہے تیرے جسم کی خوشبو صبا کے ساتھ

برسا ہے اب کے آنکھ کا بادل کچھ اس طرح
ہر نقش دل سے مٹ گیا نقشِ وفا کے ساتھ

دل خون خون ہے مگر کیا کیجئے اسے
نسبت ہے اس کو بھی کسی دستِ حنا کے ساتھ

بکھرے پڑے تھے زرد روپتے حواس کے
آندھی چلی تو لے گئی ان کو اڑا کے ساتھ

الحاج شبیر احمد

غزل

ہر روز محبت کا تری لے کے سہارا
دُنیا کی بہاروں سے میں کرتا ہوں کنارا

یاران وفا کیش بھی منہ موڑ چکے ہیں
جس منہ سے دیا کرتے تھے وہ مجھ کو سہارا

اک دل ہی تو ہے کیوں نہ اڑیں اس کے پرخچے
ہر سمت سے خوبوں نے اسے تیر ہی مارا

اے جانِ جہاں تیری محبت ہی کے صدقے
کرتا ہوں رقیبوں کی شرارت کو گوارا

پہلو میں کچھ اس طرح سے دل ڈوب رہا ہے
جوں وقتِ سحر شرق میں ہو ایک ستارا

پھر سُنبل و گُل رونق گلزار بنے ہیں
آجاؤ نشیمن میں مرے تم بھی خدارا

شبّیر جو قسمت میں ہے وہ مل کے رہے گا
"آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدا را"

محترم مصلح الدین صاحب راجیکی مرحوم

شعاعِ امید

گوہرِ نایاب کو چھینا "خزف اندوز" سے
جگمگا دی پھر مری دنیا "جہاں افروز" سے
بخش دیں حسنِ طلب پر قیس کو کیلانیاں
بوالہوس لوگوں سے آخر چھین لیں رعنائیاں

اب مرا مقدور خندہ زن تھا اوجِ ماہ پر
ذرّے ذرّے میں ہما پایا تھا میں نے راہ پر
ہیچ تھی میرے لئے اس وقت یہ دنیائے دوں
تھا ثریا سے ثریٰ میرے لئے جیسدِ زبوں
بارگاہِ حسن میں حاصل مجھے کیا بار تھا
میرے آگے سب شکوہِ خسروی بیکار تھا
خرقۂ غربت تھا خلعت سے سوا میرے لئے
کیمیا تھی تیرے در کی خاکِ پا میرے لئے
جنتِ فردوس تھی میری فضاؤں میں عیاں
سلسبیلِ عیش تھی میرے اشاروں پر رواں
میں نے چاہا اب ترے نازوں کا دامن تھام لوں
تجھ میں کھو جاؤں ہمیشہ کیلئے وہ جام لوں

ناصر نشتکانی

غزل

آرزوں کا اک جہاں تھا میں
آہ وہ وقت جب جواں تھا میں

ایک جسموں کا بعد تھا ورنہ
تو بھی موجود تھا جہاں تھا میں

میری خواہش ہی مجھ کو لے ڈوبی
ورنہ عظمت کا آسماں تھا میں

تو نے نظروں سے پڑھ لیا ہوتا
لاکھ محفل میں بے زباں تھا میں

اس کی باہوں کا آسرا ملتا
اتنا خوش بخت بھی کہاں تھا میں

اس سے پالا پڑا تھا جب ناصر
ایک دنیا سے بدگماں تھا میں

مکرم نصیر احمد خان۔ ایم ایس سی پی ایچ ڈی

غزل

کھڑے ہیں بُت بنے سارے نگر کو دیکھتے ہیں
دل و نظر ترے دیوار و در کو دیکھتے ہیں

مری تو آنکھ کے تار دل پہ اٹک گئی ہے نظر
یہ لوگ کس لئے شمس و قمر کو دیکھتے ہیں

تمہارے دل میں بھی جل اُٹھے یاد کی مشعل
ہم آہ کرتے ہیں اس کے اثر کو دیکھتے ہیں

جواب لایا ہے کیا دل کی التجاؤں کا
جگر کو تھام کے ہم نامہ بر کو دیکھتے ہیں

کبھی اِدھر کو کبھی اُس طرف نظر ڈالی
وہ کس ادا سے مری چشمِ تر کو دیکھتے ہیں

کوئی تو دیکھے گا زخمِ دل و جگر اپنا
ہم اِس امید سے ہر دیدہ ور کو دیکھتے ہیں

نظر میں کوئی بھی پردہ نہیں رہا حائل
تمہی کو دیکھتے ہیں ہم جدھر کو دیکھتے ہیں

ہمیں خبر ہے فسانہ ہے کیا حقیقت کیا
فقط ہم آپ کی حدِ نظر کو دیکھتے ہیں

پھڑک رہا ہے اِدھر دل تو اُس طرف شعلہ
یہ دیکھنا ہے کہ اب وہ کدھر کو دیکھتے ہیں

نصیر داد یونہی شعر کی نہیں ملتی
زباں کو دیکھتے ہیں سب ہنر کو دیکھتے ہیں

محمد سمیع طاہر بی اے فائنل

غزل

اُدھر شمعیں جلیں پروانہ گزرا
اِدھر تم آئے تو دیوانہ گزرا

عجب عالم ہوا ہے جب بھی دل میں
خیالِ محفلِ جاناں نہ گزرا

جو آہیں تھیں وہ بے تابانہ نکلیں
جو آنسو تھا وہ پیمانہ گزرا

محبت وہ کڑا صحرا ہے جس میں
نظر سے کوئی نقشِ پا نہ گزرا

یہی ساقی گری ہے تو یہ سمجھو
سبو خالی ہوئے پیمانہ گزرا

ہزاروں لوگ دیکھے زندگی میں
نگاہوں سے کوئی تجھ سا نہ گزرا

سید محمود سلیم سال دوم

غزل

اتنی شدت سے کسی نے تجھے چاہا تھا کبھی
کوئی یوں آگ کے دریا میں بھی اترا تھا کبھی

آج خود اپنی تمنا میں بھٹکتا ہوں یہاں
لوگ کہتے ہیں تجھے ڈھونڈنے نکلا تھا کبھی

جانے اب کس کے شبستاں میں مہکتا ہوگا
ہائے وہ پھول جو دل میں مرے مہکا تھا کبھی

کیوں مجھے چھوڑ گیا وقت کے صحراؤں میں
ایک سایہ جو مرے ساتھ بھٹکتا تھا کبھی

آج ہر خار کو سینے سے لگا لیتا ہوں
مجھ سے مانوس کوئی پھول سا چہرہ تھا کبھی

چھو لینے والے مری سمت ذرا غور سے دیکھ
میں وہی شخص ہوں تو نے جسے چاہا تھا کبھی

ہے سلیم آنکھوں میں اک خواب پریشاں کی طرح
چاند بن کر میرے سینہ میں جو اترا تھا کبھی

طاہر حارث سال دوم

غزل

کیا لکھوں میں افسانۂ غم یاد نہیں ہے
مجبور ہوں دل مائلِ فریاد نہیں ہے

پھولوں سے محبت ہوئی کانٹوں سے وفا کی
قابو میں مرے یہ دلِ ناشاد نہیں ہے

جچتا ہے بہت صحنِ چمن میری نگاہ میں
پر کیا کروں اب گھات میں صیاد نہیں ہے

ہم اپنی تباہی کا گلا کرتے تو کیونکر
خود اس کا نشیمن بھی تو آباد نہیں ہے

جو بات کہیں ان کی تو ملتی ہے بہت داد
جب حال کہیں دل کا تو کچھ داد نہیں ہے

مبارک سیف سال سوم

غزل

تیری نگاہِ ناز سے محسوس یہ ہوا
تیرِ نگاہ جیسے جگر میں اُتر گئے

منزل نہ تھی نہ راہ کا کوئی نشاں تھا
جس راہ پر وہ چل دیئے ہم بھی ادھر گئے

شاید ہماری ان سے ملاقات ہو سکے
ہم گلستاں کی سیر کو وقتِ سحر گئے

تنہائیوں میں بھی کبھی تنہا نہیں رہے
تصویر سامنے تھی تری ہم جدھر گئے

وعدہ تو تھا کہ سیف ملیں گے بہار میں
"اب کے بھی دن بہار کے یونہی گزر گئے"

محمد زکریا جاوید اولڈ سٹوڈنٹ

غزل

نقابِ عارضِ گُل سے اٹھائے جاتے ہیں
نواگرانِ چمن آزمائے جاتے ہیں

وفورِ غم سے مری چشم آج ہے پُرنم
فسانے دردِ جگر کے سنائے جاتے ہیں

چراغِ آرزو اے حسنِ گُل نہ ہو جائے
فنا کے ساز پہ نغمے سنائے جاتے ہیں

جنونِ عشق کی مایوسیاں کہوں کس سے
دلوں سے نقشِ وفا تک مٹائے جاتے ہیں

کمالِ شوق کہ شوقِ کمال ہے جاوید
کہ بزمِ "المنار" میں ہم کچھ سنائے جاتے ہیں

عاصم صہرائی

غزل

وفا ہوگا مرا وعدہ کہا اس نے قسم کھا کر
دلِ نالاں، چلو محفل میں ہم بھی دیکھ لیں جا کر

یہی ہے آرزو اپنی کہ سوتے ہی رہیں ہر دم
اچانک خواب میں مجھ سے ملے جو ایک دن آ کر

تری خاطر ہمیں منظور رہے کانٹوں پہ چلنا بھی
جو چاہو آزمانا تو بچھا دو راہ میں لا کر

غمِ دوراں کو محفل میں تری ہم بھول جاتے ہیں
سکونِ دل کو ہم نے بارہا پایا تجھے پا کر

مرے جُرم و گنہ کے داغ دھوئیں گی یہ کیا عاصم
اگرچہ یہ گھٹائیں بارہا برسی ہیں چھا چھا کر

منیر احمد قریشی

غزل

کچھ یاد آرہا ہے نظاروں کے ساتھ ساتھ
آندھی سی اُٹھ رہی ہے بہاروں کے ساتھ ساتھ

اُن سے وفا کی آس ہے، نہ کچھ اپنا حال ہے
اب جی رہے ہیں غم کے سہاروں کے ساتھ ساتھ

یا تو نزال کے دور سے ہوتی تھی ابتدا
یا لٹتا آشیاں ہے بہاروں کے ساتھ ساتھ

ہنستے ہیں اپنی عشق کی نادانیوں پہ اب
چلتے تھے ہم بھی ان کے اشاروں کے ساتھ ساتھ

انجام کیا مرا ہے کہ آغازِ عشق سے
جینا پڑا تھا باغ میں خاروں کے ساتھ ساتھ

یہ رازِ زندگی بھی حقیقت ہے تلخ سی
اُڑتا ہے رنگِ حسن بہاروں کے ساتھ ساتھ

دولت کی اس جہاں میں پرستش منیر ہے
مرتے ہیں لوگ اونچے دیاروں کے ساتھ ساتھ

مبارک احمد طاہر

غزل

عجب عین سرِ چہ ترے رُخ کا آفتاب آیا
مری تمنا کی دنیا میں انقلاب آیا

مرے سوال کو ٹھکرا کے رکھ دیا تُو نے
میں تیری بزم سے اٹھا تو لاجواب آیا

گو رُخ چھپائے سرِ رہگزار ملتا رہا
پہ جب بھی خواب میں آیا وہ بے نقاب آیا

عمر بھر رہا وہ چاند مجھ سے شرماتا
چلے جنازہ اٹھا کر تو بے حجاب آیا

مری لحد کی شبستاں میں ہے چراغاں سا
کہ آج مرقدِ طاہر پہ ماہتاب آیا

لطیف گجراتی بی۔ایس سی فائنل

غزل

کُو بہ کُو جب حُسن کا چرچا نہ تھا
عشق بھی یوں ہر کہیں رسوا نہ تھا

جب تلک کہ چاند کو دیکھا نہ تھا
میں اندھیری رات سے ڈرتا نہ تھا

آپ کے جانے سے پہلے بزم میں
ایک آنسو شمع کا بہتا نہ تھا

نیند اگرچہ کالے کوسوں دُور تھی
چاند ابھی تک بام پر اُبھرا نہ تھا

یُوں گماں ہوتا ہے تجھ کو دیکھ کر
مَیں نے پہلے آدمی دیکھا نہ تھا

آدمی سے آدمی بیزار ہو
آج سے پہلے کبھی ایسا نہ تھا

ہاں کہاں ہم اور کہاں تیری گلی
پر سوا اس کے کوئی چارا نہ تھا

یوں گلے لگ کے ملا وہ کل لطیف
جیسے میں نے لوٹ کے آنا نہ تھا

ظفر عامر

غزل

اے شوخ تیری بزم کا یہ کیسا رنگ ہے
جو خندہ زن ہے شمع تو بسمل پتنگ ہے

اک بھیگی بھیگی رات ہو اور تُو قریب ہو
جی میں ہمارے سادہ سی یہ بھی اُمنگ ہے

اقرارِ ترکِ مے کشی میں کس طرح کروں
تیری نگاہِ ناز بھی مے کی ترنگ ہے

پلکیں جُھکی جُھکی ہوئی گیسو کھُلے کھُلے
سادہ دلوں کو لُوٹنے کا یہ بھی ڈھنگ ہے،

جو تیرے دم قدم سے تھا اب تک رُکا ہوا
لو آج میرے اشکوں میں اُس خوں کا رنگ ہے،

اک تُو، کہ بام و در پہ بھی رقصاں ہے زندگی
اک ہم! کہ ہم پہ عرصۂ ہستی بھی تنگ ہے،

اے فتنہ ساز حسن کہ تجھ کو خبر نہیں
عامر تمہارے شہر میں بے نام و ننگ ہے

بشیر احمد طاہر۔ ایف۔ اے سیکنڈ ایئر

جو کرنا ہے کر لو ابھی تم جواں ہو

میری قوم کے اے بہادر جوانو!
ذرا خواب غفلت سے خود کو جگانا
اُٹھو آنکھ کھولو زمانے کو دیکھو
کہ ملّت کا بارِ گراں ہے اٹھانا
نظر ڈھونڈتی ہے تمہیں تم کہاں ہو
جو کرنا ہے کر لو ابھی تم جواں ہو

یہ دُنیا تو گردش میں آئی ہوئی ہے
یہاں چار سُو انقلاب آ رہے ہیں
یہاں بھائی بھائی کا دشمن ہُوا ہے
غضب ہو رہا ہے عذاب آ رہے ہیں
یہ ممکن ہے یارو کوئی امتحاں ہو
جو کرنا ہے کر لو ابھی تم جواں ہو

بھڑک اُٹھے شعلے جو جنگ و جدل کے
تو جل جائے گا اس میں سارا زمانہ
اخوّت محبّت کا پیغام دے کر
زمانے کو اس آگ سے ہے بچانا
صدا دے رہا ہے جہاں تم کہاں ہو
جو کرنا ہے کر لو ابھی تم جواں ہو

جہالت، تعصّب، یہ دیوارِ نفرت
ہے تخلیقِ باطل اسے تم مٹا دو
رواجوں کے پہرے سماجوں کے پہرے
ترقی کی راہ کے یہ روڑے ہٹا دو
زمیں خود کو سمجھے ہو، تم آسماں ہو
جو کرنا ہے کر لو ابھی تم جواں ہو

اسی سے ہی ممکن ہے تکمیلِ انساں
خدا کی محبّت، خدا کی اطاعت
آدابِ خلقت ہیں آدابِ خالق
اسی سے مرکّب ہے تیری نیابت
خدا کے ہو مظہر خدا کی زباں ہو
جو کرنا ہے کر لو ابھی تم جواں ہو

ساحر حبیب سال سوم

غزل

پیغامِ دل سمجھ لیا ہے آخر ہواؤں سے
یادیں اڑا کے لائی ہیں جو تیرے گاؤں سے

یہ زندگی تو پیار کی خوشبو میں بس گئی
کانٹوں کو آگ لگ گئی پھولوں کی چھاؤں سے

احساس جل رہا ہے جوانی کی آگ میں
مستی چھلک رہی ہے خرد کی گھٹاؤں سے

مقبول ہو گیا ہے مرا سازِ بے نوا
رنگِ وفا ٹپک پڑا تیری جفاؤں سے

AL-MANAR

January, February, March

1968

Talim-ul-Islam College

MAGAZINE

AL-MANAR

Talim-ul-Islam College, Rabwah

MAGAZINE

JANUARY, FEBRUARY, MARCH
1968

Convocation Number

Professor-in-Charge
HAMID AHMAD CHAUDHRY, M.A.

Editor-in-Chief
NAEEM OSMAAN

Editors
MUNAWAR AHMAD ANEES
ABDUL BASEER HAI

CONTENTS

1. Editorial ... 1

2. Ode to the Lord ... 6
Anonymous

3. A Sacred Memory ... 7
Naeem Osmaan

4. The Boy who Caused Sensation ... 9
A. Jalil Sadiq

5. Rabwah after Independence ... 13
Daud Tahir

6. Radar in Action ... 18
Munawar Anees

7. Rosy Cheeks ... 20
Mohammad Zafrullah

8. The Inevitable Journey ... 21
Rafiq A. Akhtar

9. Fantastic ! ... 23
Naeem Osmaan

10. A Fallacy Corrected ... 34
M. Zafrullah

11. Invited Killer ... 39
Baseer Hai

12. Wake Africa ! ... 43

13. S. O. S.—Save Our Souls ! ... 44
Editor-in-Chief

14. To the Editor——! ... 51

15. Mona, My Mona, ... 54
Hemeidy Mbano

16. The First Sight ... 55
Usman Akbar

17. Another Ball in the Basket ... 58
The Heros of Ravi ... 60
They Discussed Asla and Jazba ... 61
Naosmo

18. That Lass ! ... 62
Naeem Osmaan

19. Eaves-Drops ... 63

20. Hello Mr Er..... ... 65
Baseer Hai

21. Language Speaks Itself ... 67
Munawar Anees

22. College Round-up ... 72
Reporter

Printed at the Nusrat Art Press, Rabwah, and published by A.R. Junaid Hashmi for T. I. College, Rabwah, W. Pakistan.

The Principal at Convocation

The Principal Qazi Mohammad Aslam, M.A. (Cantab)
presenting the Annual Report at Convocation.

بسم الله الرحمن الرحيم

نحمده ونصلي على رسوله الكريم

Al-Manar

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE, RABWAH

MAGAZINE

Vol. XVII	January, February, March, 1968	No. I

Editorial

A word to new graduates

The present issue of Al-Manar is being distributed on the eve of Convocation. On this auspicious occasion we extend our earnest greetings to the recipients of degrees and awards and pray that they may continue receiving honours in future. The new graduates are happy on reaping the fruits of their labour but they will not forget that labours do not materialize unless they are blessed by the Almighty. Our heads should therefore bow in all humility and gratitude before the One who crowns our efforts with success.

Nobody can deny that degrees are not ends in themselves. They are only means to a successful career, a sort of equipment one needs in the real struggle of life

that follows. The scope of OUR efforts is larger than others because of our greater targets. We have not only to earn a respectable living for ourselves but have to play our part in the resurrection of Islam which needs a pledge to rededicate ourselves with all energies at our disposal for a sacred cause. Students of T. I. College stand committed to the war that Islam has waged against forces of evil, for we believe that the slavation of man, both here and hereafter, lies in the lap of Islam. All ills of the present world are due to the world's indifference to the dictates of Allah. If they embrace Islam and adopt its values, the future may bring them a message of peace and prosperity—political and social, temporal and spiritual.

Our job, therefore, is to inculcate Quranic values in ourselves and present before the world a model of true Islam. For this is what the world expects from us. This is what we claim. Unless we present ourselves as a living example of true Islam it is no good to preach. Example is better than precept.

Let us once again pray that God may enable us to remember the good lessons we have learnt at this institution and incorporate them in our practical lives so that our professions and actions should bear witness that we are true products of Talim-ul-Islam College.

★ ★ ★ ★

And now to Books

The previous few months have seen a lot of activity to distract the attention of the students from their studies. Immediately after the dawn of the year, *Idd* came with all its happiness and joy.

This occasion was followed by the Annual Gathering of the Community which made the students keep away from their

lectures and studies for another few days.

Many a student must have made New Year resolution to get back to their studies immediately after the Annual Gathering. But the excitement of activities in the college made many to break this resolution, no matter how sincerely it was made. The few weeks that followed these religious occasions witnessed the excitement of games and debates. College books and lectures were again neglected to quite an extent by the enthusiasts of games and debates. A good number of hostel students took over to the practice of regularly practising Table Tennis—Carrum-Board and other indoor games, to try their luck for championships in the Annual Indoor Games of the Fazal-i-Omar Hostel. Basket-ballers had their own wish of winning the Board and University Basketball Tournaments as well as other All-Pakistan Tournaments including the 10th All-Pakistan Nasir Basketball Tournament held with all its pomp and show and traditional enthusiasm at Rabwah during the second week of February. Debaters and speakers got themselves busy in writing and cramming speeches to win honours in the college, All-Rabwah and All-Pakistan debates held under the auspices of the Talim-ul-Islam College Students' Union and some crammed more sincerely to compete in out-station debates and declamation contests. Rowers exercised their muscles regularly to show their skill at the Board and University Rowing Champion-ships and athletes took over their regular practice to try their luck at the University and also local college sports and athletics meet'. In some way or the other, a vast scope of activity had been set open for the students to refresh themselves and also win honours in their respective spheres. For those who did not or could not participate in all these activities to win honour for themselves, there was always an excuse of witnessing the activities to encourage their respective favourates.

In some way or the other, nearly every student has had an opportunity of sharing the excitment and activity of these previous few months and there could hardly have been any student who could not find a good excuse to skip his studies for at least a short time. There may also be many others who still experience the fatigue of the previous few months though the show is over and the curtains have already been drawn. Champion-ships have been won and honours have been awarded to those who tried their best and did their best.

But this does not end the competition. There is still a wide scope of competition in the coming few months and these competitions are not of choice but to quite an extent, obligatory. The awards that have already been granted were of choice and not necessary but the awards that have to be won in the future are compulsory. Extra-curricular activities are a secondary purpose but sincerity and devotion to the academic cause is our primary purpose for which we all have left own near and dear ones and also the comfort of our own homes. Distinctions in extra-curricular activities is an extra merit to us but success in the academic sphere is not only a merit but also a must. Many have rejoiced their luck for winning distinctions in other activities and many have rejoiced the luck of their friends and acquaintances. But the time of rejoicing should be cut short now to do a proper justice to our sole purpose. The local examination of the first year intermediate and degree classes are expected to commence shortly. The examinations of the final year intermediate classes are expected to commence in the first week of May and those of the degree classes soon after, in the first week of June.

Passing these respective examinations is a must for every student and a failure may result in disappointment

which may not be easily foreseen. We have seen enough of physical activity and enjoyed the fruits of our physical labour already. It is high time now that we devoted a better and more sincere attention to the mental side and worked harder to make provisions for enjoying the fruits of our labour in our future lives. This is the time to take over our books seriously and prepare ourselves for our examinations if we wish to make our lives happier in the future.

Al-Manar expects that its advice to the students of T. I., to give a better understanding to the cause of their studies will not go un-heeded and wishes all of them the best of luck in their respective examinations. May the fruits of their labours be sweet. Amin !

Deft Definitions

Lecture : Something that can make you feel numb on one end and dumb on the other. *Cye N. Peace*

Experience : What causes a person to make new mistakes instead of the same old on. *Enos Magazine*

Political Campaign : A matter of mud, threat and smears. *Jack Kofoed*

Smog : The air apparent. *Rod Maclean.*

Inflation : When nobody has enough money because everybody has too much. *Harold Coffin.*

Anonymous

Ode to the Lord

O ! thou who didst create this all,
Who dost preserve it, lest it fall,
Who will destroy it and its ways,
To thee, O heavenly Lord, be praise

As into heaven's water run
The taste of earth - yet it is one,
So thou art all the things that range
The universe, yet dost not change.

Far, far removed, yet ever near ;
Untouched by passion, yet austere ;
Sinless, yet pitiful of heart ;
Ancient, yet free from age - Thou art.

Though uncreate, thou seekest birth ;
Dreaming, thou watchest heavens and earth ;
Passionless, smitest low thy foes ;
Who knows thy nature, Lord ? Who knows ?

Though many different paths, O Lord,
May lead us to some great reward,
They gather and are merged in thee,
Like floods of Ganges in the sea.

The Saints who give thee every thought,
Whoes every act for thee is wrought,
Yearn for thine everlasting peace,
From bliss with thee that cannot cease.

Naeem Osmaan

A Sacred Memory

Though days have sunk an' years drowned,
The grief of ours on his loss has yet no bound,
A melancholy does wail since the light did fade,
Since the love of His to His laps the Lord bade.

To us He graced a human though yet a bliss,
The heart yet does glow in praise of his,
Loved as Bashir our hearts he enshrined,
And Love Divine on our souls he enjoined.

Like him in history but a few were graced,
Mahmood he was the divinely praised,
True to his name the tidings divine he gave,
From the destined doom, the mankind he tried to save.

Meek at heart and devoted to duty,
For us he dug the springs of beauty,
To mankind he pleaded for evil to shun,
Our lives he burdened for generations to come.

A lion of Islam—a fighter of Lord,
For crusades holy never slack but always abroad,
Kudos petit none but the Lords love he crave,
For His battels, he fought the world - none so brave.

His victories do shine an' yet linger bright,
The banner of Islam he raised to zephyrical sight,
His memory remainth fresh in mind an' soul,
He defeated the Satan an' Satan's play foul.

But he left us then to join the One,
That loved him more—second to none,
Unlike scores that come an' scores that go,
Blessings of his for times immemorial will flow.

He left us sad, our hearts heavy, our spirits low,
His love in our heart does live an' yet will grow,
A mortal he was—he was to go,
To thine judgement O ! Lord our souls we bow.

A Small Contribution

An enormously fat woman got on an already overloaded bus. For a little while she kept standing, then looked down at the men in the seats and snarled, 'Well is'nt any gentleman going to offer me his seat?' At this a small wisp of a man got up and said, 'Well lady ! I am ready to make a small contribution'.

Editorial Board in Conference

The magazine is practically without an office of its own. The Editorial Board, for official business, has to meet very often in the college corridors. Sometimes they meet at Prof. Hamid Ahmad's residence. Occasionally they manage to get the key of the Union Office which has been temporarily alloted for the purpose.

Left to Right : Munawar Anees, Ch. Hamid Ahmad M.A., Naeem Osmaan and Baseer Hai.

A. Jalil Sadiq

The Boy who Caused Sensation

'Have you seen Haider?' asked Asam. 'Don't talk of that fellow. He makes me sick,' retorted Naeem.

Asam looking jolly serious continued, 'Believe me, Haider has become what he never was. We are better without you. We can lose a match by runs but not by wickets', the words were sufficient to induce quietism, 'Rasul got his muscle pulled. We are badly handicapped'.

Naeem was to lead a side against Saifi's eleven and this match against Saifi's was important. They were old rivals. It had become a matter of prestige for the teams.

Naeem's accurate bowling coupled with Rasul's tremendous pace always compensated his team's weak bat. Saifi's keen fielding side and strong bat offered him a terrific challenge. Rasul's absence created several problems. But Asam was confident on his part. His new confidence injected his team-mates and when Naeem saw Haider against warriors, another important side, his inclusion was considered for the the first time. Haider's fine hat-trick and a maiden century was a zeal to watch. Naeem agreed attributing his all-round programme to sheer stroke of luck. Naeem patted Haider but how suggestive was the latter's reaction. He asked, 'I am afraid I am no cricketer and have no idea of bowling apart from the little I have gathered from watching your side.

'Oh! if it is so,' gasped Naeem,' you are a demon bowler and a match-winner.' Haider was taken to net practice. He was tried. Naeem was the first to face. Haider took the ball, weighed it, surveyed the wicket, asked Naeem if he

was ready and bowled. Naeem stepped forward, lashed at the ball mercilessly but lo! the ball knocked the middle stump. Naeem wanted his revenge and the minimum was to have a six in the next ball. A batsman who had always proved the backbone of Naeem batting side was so easily dismissed was a chance, cried Asam, the only favourite of Haider. Zafar prepared himself to face the next delivery. Haider had a small run, made an easy and a graceful action. The ball, unlike the first delivery, railed too high, too slow. Zafar leaped forward and lashed out. Asam was laughing. Zafar was returned and the wickets were lying flat on the ground.

'Saved! We are saved chaps! We've found a match winning bowler. Haider, you are the hope of the team. We shall beat Saifi's after all', half a dozen fellows crowded on Haider. He was making repeated protests but his demonstration at the net practice was amazing and far from chance.

The match started. It was the final of school divisions. Old rivals were meeting again. Both sides were reinforced. Saifi won the toss and gave Naeem the bat, fully confident to dislodge Naeem's team cheaply in the absence of Rasul. Naeem opened the inning with Jaffar. They batted carefully and picked the right ball to smack at, but as the bowlers were steady and fielding tight, the runs mounted slowly.

With ninteen on board, Jaffar saw his off stump flying in the air. With a pained look at the bowler responsible, he trudged back to the pavilion.

Thirty minutes had elapsed. Only forty runs were on board and it was reading three wickets down. Naeem was still keeping the other end. He could not do much but to see the fall of wickets on the other end after every two

minutes. Asam was the fourth bat to go on duck. The score-board read fifty-nine only.

Naeem gasped! He never expected Asam to go so soon and at such a crucial stage. After Naeem, Asam was the hope of the team. His departure was a returning blow to his side. Naeem thought of his words and weighed their consequences 'We can lose the match by runs not by wickets'. Was this said in a dream? 'No! Never!,' he recollected himself.

Haider faced the first ball. It was a good length. Haider stepped forward but the ball gently rolled on to the point. The second ball, he leaned back and drove it straight to the boundary. The fielder remained where he was. The ball had covered the distance at an electric speed. Haider made a cover drive at the fourth ball and it crossed the line adding another four to his first four. Naeem smiled with pleasure. An irresistable wave of pleasure passed through his body. He anticipated a possible come back. Lo! the next ball is subjected to a lofty hit. It pitched outside the boundary line. The score now jumped from fifty-nine for eight wickets to seventy-three for eight. He watched the bare ball carefully and stopped it allowing Naeem to have his share. After all the latter had come to have his share, to show something. Haider had miraculously emerged into a bat. Hundred was scored without any further loss. Haider continued the punishment. Saifi tried all his bowlers. Spin, pace and medium were tried but Haider was a rock unshaken and unshakable. Haider reached his magnificent half century. Naeem was still lingering on forty-three. A magnificient seventy-nine came from this bat. The team was out of troubled waters. The score read one ninty-four for nine and one man to go but he was cheaply dismissed at eight runs. But still it was a wonderful recovery after a disastrous start.

Saifi sent his openers after having a little conference with his team. They put on ten in the first two overs and were getting themselves nicely set. There was no reason why they should not score fifty a piece before declaring as Naeem's two best bowlers had been tried and they had sent up very poor stuff. Naeem brought Haider in place of Asam.

It was Rashid who had the honour of facing Haider and he looked about him in all directions as though picking a likely spot for a six to drop without hurting any one.

The first ball that Haider bowled was slow. Rashid offered a stroke but was surprised to find his off stumptorn off. Saifi, the Captain of the team was the second to face Haider. He attempted a lofty shot but narrowly missed his leg stump. He waited the next delivery, leaned back and swept the ball to long leg but to his surprise, it was a complete miss. Saifi was not bowled but stumped. Haider took another wicket with his last ball. The score slumped from ninteen for nil to ninteen for three.

In the next over he did the hat-trick and as Naeem had taken a wicket too there were eight wickets down with only seventy-seven runs on the board.

News travelled fast and by the time Haider bowled again, a small crowd had collected at the ground. People who had never watched a junior match since being juniors stopped to watch. There was an air of running happiness in Naeem's team. The honour of the team had been brilliantly regained.

The last man who had been urged to keep his wicket up for as long as he could had been told to play back and watch the ball. Pale and shaken, he complied with the orders and watched the ball right on to the middle stump.

Naeem had won. Cheering and laughing, they saw what they had never expected. Haider had caused sensation!

Daud Tahir

Rabwah after Independence

In 1947, the partition of the Indo-Pak. Sub-continent took place. The parts with Muslim majority were to be given to Pakistan. But due to the unexpected decision of the British government, rather Red Cliffe, the representative of the British government deputed with the partition work, whole of the Gurdaspur District with a Muslim majority was handed over to Bharat.

Qadian, a city in Gurdaspur District, situated about forty miles from Amritsar, was the centre of the Ahmadiyya community. Qadian was given to Bharat and Ahmadis were forced to leave Qadian. Only a few people — 313 to be very exact (afterwards known as Darvesh) were left there to guard the shrines at Qadian.

Now the problem was to form a new centre for the Ahmadiyya Community. A temporary centre had already been made in Lahore. Various proposals were made by the Ahmadis, many places were suggested for the new centre, but they were not considered suitable by Hazrat Khalifatul Masih the Second. After partition, an Ahmadi told the Caliph about a place which he had seen and thought was suitable for the settlement of the Ahmadiya Community. It was a site five miles from Chiniot, situated on the banks of the River Chenab.

In 1947, by the order of Khalifatul Masih II, Nawab Mohammad Din and Chaudhry Asadullah Khan surveyed this area. The site was also seen by the Head of the

Ahmadiyya Community and was selected for the new centre of the community. At that time it was barren and full of salts and sands. There was no water under the surface and no sign of life was seen here. Trusting the God Al-Mighty, the head of the community, Hazrat Mirza Bashir-ud-Din Mahmood Ahmad, Khalifatul Masih Second, (May God be pleased with him) laid the foundation of Rabwah, the centre of the community on 20-9-1948. After this, four goats were sacrificed and prayers were offered, as Hazrat Ibrahim had offered when he was erecting the shrine of *Kaaba*. As the time passed on, more and more Ahmadis poured into Rabwah resulting in an increase of Rabwah's population. Many names were suggested for the new centre as *Zikra*, *Darul-Hijrat* and *Madina-tul-Masih*. At last the name *Rabwah* was suggested by Maulana Jalaluddin Shams. In a verse of the Holy Quran, it is said that Jesus and his mother will migrate to a hilly place. Rabwah, literally means a high place. Hazrat Khalifatul Masih II accepted this name and the name of the new centre was declared on the day of its foundation.

Although the foundation had been kept yet the Ahmadis had to face many difficulties. This area had already been declared as un-inhabitable and non-agricultural. The first great difficulty was of obtaining water. Some tried to get water and thus they dug many tube wells.

Though they were successful, this water was not good as the doctors declared it harmful for health. But the Ahmadis were not disheartened and continued their efforts. They knew that God would help them. At last by the grace of God this difficulty was removed.

Just after the foundation of Rabwah, the work of its development started rapidly under the leadership of

Khalifatul Masih Second and soon afterwards this deserted land began to take the shape of a beautiful town. But there were still many hurdles to overcome to ensure a more satisfactory development. The population was not increasing rapidly as there were no employments for the people. Although the railway track and a road passed through this town but to the dismay of the people of this town there was no railway station or any transport facility for them. There was no shopping centre, no Post Office, no school or college and even electricity was a problem.

During the early days of the life of this infant town, people suffered great troubles. The people who lived in those hard days really sacrificed their lives following the command of their beloved leader. Imagine the hardships of their lives as this land was deserted from one end to the other offering no favourable conditions for their survival. But these brave people managed to live in those hard days and to continue their struggle against all the hazrads. And their great struggle and effort blossoned with the flower of prosperity and happiness when the so called desert began to give rise to the buds of life.

During this passage of development the population started growing rapidly. Though the increase in population created many problems, the people of Rabwah, by their tireless efforts, overcame every possible problem and were able to provide every facility necessary for their lives. Gradually the development work was carried on. To remain in touch with the civilised world, a few educational institutites were established. Today there are two colleges for boys and girls. Both of these institutes have well trained staff and large buildings. There are two high schools and five primary schools. Our educational institutions are so reputed

that half of the total students enrolled are out-siders, that is, they come from other parts of the country.

Above all, the Jamia Ahmadiyya is an institution with a very special purpose. It is busy in preparing the Ahmadiyya youth to face the great challenges to Islam. There are students from many parts of the world getting educational benifits in this institute. Jamia graduates, with their solid knowledge of different religions of the world, do a great service to the cause of Islam and Ahmadiyyat. There are mainly three administrative offices, namely Tahrik-i-Jadid, Sadar Anjuman and Waqf-e-Jadid, which are responsible for various activities of the community. They not only deal with the internal spiritual development in the country, but also do a great job of controlling the world - wide missions working for the cause of Islam.

There are nearly 15 libraries in Rabwah. This vast collection of books helps the people, working in various fields, to keep in touch with recent developments in their respective fields.

Ninteen years after the foundation of Rabwah we see it much developed. Hundreds of beautifully built houses are scattered in an area of over a thousand acres with a population of nearly fifteen thousand. There are nearly twenty mosques in different parts of Rabwah. There is a big Railway station, telephone exchange office, a day and night post office and a good hospital fully equipped with modern medical facilities. Sui-gas is also expected in the near future. A big *Bazar*, situated in the middle of the town serves the people in houseware etc. A big hall called Aewan-e-Mahmood is already completed. The biggest mosque of Rabwah, *Aqsa*, is under construction. An increasing number of students from Rabwah and outside have

Our Professor S. M. Shahid, M.Sc. (Alig.); Ph.D. (London); Associate Member of the Royal Institute of Chemistry who represented the college in the All Pakistan Science Conference held at Dacca in the first week of March 1968.

Dr. Zafar Ahmad Vaince, our Professor of Economics, (currently on leave) has recently obtained his Ph. D. degree at the University of London. The special subject of Dr. Zafar's research was "The impact of European Common Market on the Developing Countries."

compelled the local authorities to build a new college which is expected to be completed by 1970.

The rapid speed with which Rabwah has developed is very appreciable. Due to this quick development, Radio Pakistan Lahore became keenly interested and broadcast a feature programme about its development, Apni madad app'. Within a few years at the place which was barren and deserted, we have every facility of life. Rabwah has made progress in every field of life, social, religious, educational and even in games. Keeping the past in view, we can say that we have a brilliant future for this centre of the Ahmadiyya community.

BRAIN TEASERS

1. From Tom Mcleoy's books, 'Fun with figures;' 'Make 1000 by using only eight 8's.'
2. In the following letters, a logical sentence may be obtained by removing all un-necessary letters : AALLOUGNINCEACELSSSEANRYTELNETCTEERS.

ANSWERS

1. 8 plus 8 plus 8 plus 88 plus 888 equals 1,000.
2. Remove ALL UNNECESSARY LETTERS and A LOGICAL SENTENCE will remain.

Munawar Anees

RADAR IN ACTION

Sargodha—the strategic airfield of Pakistan Air Force was the main target of the Indian bombers during the last September war. The Indian bombers employed every technique to destroy this major airfield but the Sargodha airstrip remained undamaged and thus it enabled the P.A.F. heros to be air-borne all the time to welcome the Indian *Canberras*. The whole credit goes to the brave pilots but few people consider the *Magic Eye*, working round-the-clock to track the enemy planes and warn their approach. This magic eye is the Radar—which gives a real vision to the pilots.

Many people familiar with this word believe that the technical process is so involved as to be beyond their comprehension. Actually, it is simple in principle. Let us see how this magic eye works.

Radar which stands for 'Radio detection and ranging' is based on the discovery that every short radio wave is reflected back by a solid object somewhat as a shout bounces against a cliff and returns as an echo. The large revolving aerial conspicuous at civil and military airports is a part of a warning system which scans the skies and reports the approaching planes long before detection by human eye. The aerial revolves continually 26 times per minute. The whole system looks like a search-light having the transmitter in the position of a light bulb, and the concave grid serving as a reflector. The aerial throws beams of radio microwaves which fanning upwards and downwards, brush the sky in a

circle of about 50 miles in radius. When a plane enters the *wave-stricken* area, the waves that hit it are reflected back to the aerial.

You shout and then wait to hear the echo of your voice. Radar does the same. It sends its waves in the form of short pulses lasting for one micro-second. Then the sending device is automatically switched and it behaves like an electronic receptor to pick up the reflected echoes. The ehoes are caught by the curved reflector and are focused on the transmitter.

The transmitter relays these echoes in the from of signals to the control panel, where the operator faces a screen much like that of a television set. The screen reveals the area of the sky scanned by the aerial. An electronic arm pivoted in the centre turns round the screen in exact harmony with the revolutions of the aerial. The electric charge of the coming plane's echo is transmitted to the arm and it stimulates the sensitive layer of the screen to form a spot of light called a blip. The blip appears at the same point on the screen corresponding to the plane's position in the sky. The image of the blip glows until the aerial performs another revolution and picks up the new position of the plane. Thus the operator is able to see the planes coming from all points of the compass simultaneously.

The top of the screen points towards north and the observor comes to know about the exact position and direction of the plane. The time consumed by a signal in bouncing back from the plane gives the distance of the plane from the airfield and is calculated automatically, while the plane's blip flashes on the screen at a corresponding distance from its centre.

The civil airports are supplemented by a 'Ground Control

Approach' which keeps the tracks of incoming planes down to the runway, facilitating the operator to 'talk the pilot down' by radio during odd landing situations.

You have seen how this magic eye works for the all-round safety. Radar techniques have much developed during the last decade. Increasing data of multi-purpose rockets and satellites have made it necessary to scan their orbits in the crowded space to avoid any mishap. Nuclear missiles call for sophisticated radar techniqnes for an early warning of the coming disaster. Realising this need, big powers are developing ultra-modern radar techniques to ensure their integrity as radar is the backbone of any strategic force in the world.

Mohammad Zafrullah

ROSY CHEEKS

When the rosy cheeks glow ;
Radiant flush of love of thee ;
No more reason straineth thy brow ;
With all thy loveliness come to me ;
Let thy charms and love flow ;
And my thirst of desire quench ;
Come, my fairy crook thy wings ;
Come like aroma from a flower bunch ;
Relieve my soul from grief strings ;
Strengthen me against the foils wreunch ;
Make me break the hardship ;
Come flying into my arms ;
With all thy beauty all thy charms.

Rafiq A. Akhtar

The Inevitable Journey

The inevitable journey is soon to come,
And all that I have known,
Will be left behind,
To lay beneath the sun,
Maturing in it's warmth,
Under a tree,
In a living room,
Listening to the sound of light,
Falling to the ground,
Protecting me
Is a part I could not take
On the inevitable journey,
I will need her hand
To guide me along
The unprinted sand
In a cloud of smoke
Filling our souls
Talking of peace
And all that is free
I can still smell the scent
In the pocket of my coat
Where I hid the moments
We shared together
With the laughter of a fire
In her sparkling eyes
As she watched the fragrant Eucalyptus
Dancing through the air.

The inevitable journey has arrived
To carry me away across the sea,
Where living is old
And memories become new
As I wander across snow covered peaks
With thoughts of home
Keeping me warm
The sun, my friend
We're together again
To travel abroad
This country anew
Means experience
Unshared with one I know
That I will miss
Not hearing
The sound of her voice
As my echoes return
Unanswered in the wind
Coming over the mountains
From across the sea and land I left
Where she lives.
From the inevitable journey
That carried me away
I will return again
To live some days
By the cosy side I know
I will share with her
The journey I have made
And all I've learned
Of life and love.

Naeem Osmaan

Fantastic !

Views expressed here are solely those of the writer and may not coincide with those of the Editorial Board—Ed)

Faanntaastic. Thats what it was. Oh! no, It isn't that. But that's what they all are. Yes, that's much better a statement. That's what they all are—Fantastic. I don't know what you think of them but I think they are really fantastic. Believe me or not, they really are that. I realised it the other day only. Or probably I realised it earlier too. But no, I could'nt have realised it earlier because I am sure I realised it the other day only. I realised that there was something about them that was not really ordinary and that they were all fantastic. Yes, it was the other day when I saw one go past me. At first I thought it was an angel and I was scared. As good as scared our of my wits. I know you will laugh at me, so go ahead and laugh. So what if I was scared. It could have been *Israel* you know and I don't want Israel to come for me so soon. I still want to see and enjoy a hell of a gay life. Anyway, as I said I saw this thing I thought was an angel and I was scared at first. But then, when this angel went swiftly past me, I got my breath back and that lousy lump of fright that had stuck in my throat on the sight of this so thought angel pushed itself down. I felt good then. I had to. I don't know if you know it but this lump can feel a damn bad. Ever had one in your throat? I suppose not. Well if you want to know how it feels, go ahead and push a full over-sized potato in your throat

and see how it feels. I would be something of the sort though not as bad as the experience of a lump of fright stuck in your throat. Still it would be an experience. Anyway, I was saying I felt good, because I was scared no more when I realised that it wasn't an angel but something else that had walked past me. It was then that a thought struck me like a .22 bullet and registered in my mind that it was something fantastic and I don't doubt it anymore. It was fantastic and thats what they all are. Could be you think otherwise but I'm convinced that our modern *Burkhas* are really *fantastic*.

When I was a kid, I still remember, my theology teacher, Maulana Pious, told me that Islam commanded upon all women of the faith to cover all such parts of their physical-selves which could cause a growth of indecent and unethical thought in the minds of their fellowmen. I was quite a kid then and Maulana Sahib did not probably bother to tell me more than he actually did. But by telling me the little he told me, he sowed the seed of the Islamic concept of Pardha in my mind. He had probably thought of telling me more about it at a later age but then I didn't give him a chance to do that. I was quite a dodger and I usually dodged the lesson he came to give me. I don't know how he felt, but I think he couldn't have minded it. I was giving him expenses paid leave on the expense of my dad's purse. Anyway, it was at quite a better age, that I asked my mum why she wore that black-garment over her other clothes and she told me that she had to wear it in accordance with the Islamic command of Pardha. I stopped the questioning at that. I didn't want my mum to realise that I didn't know much about my religion and thus request Maulana Sahib to take over my theology lessons again. But after all these years and after seeing much of the modern burkha and learning

a little more about pardha, I doubt if the modern burkha is anything really worth in the sense of pardha. The more I think of it, the more I doubt if the modern burkha really meets the expectations of the Islamic concept of Pardha. I always feel as if I'm looking at two separate poles. The North Pole and the South Pole. And when I try to prove that the two are one and the same, in some or the other logical way, I always end up frustrated with the thought that one is a practical reality and the other a theoretical. conception. No matter how I try, I always feel as if I'm trying to prove, in some logical way or the other, that the North and the South Poles are really one and the same.

Though I quite realise that people accept burkha to be a medium of pardha, I still can't make myself accept, after seeing the modern Burkha, what they have already accepted. Don't the hell for heavens sake shout your guts out on me. I can't help if I can't make myself accept a thing. If you say that these neatly stitched and masterly tailored garments in blacks and whites are burkhas, I agree with you because that's what you want to call them. But call them pardha and I say, baloney ! A lie in black and white and that's where we go on a detour. Who ever thought of them as pardha! I don't if you do and I even doubt if one can ever be justified in calling these modern burkahs as anything in line with the Islamic concept of Pardha.

I may not know a thing, but if I know any, I know that this modern stuff we call burkha in the east is as good a fashion of our society as mink coats are a fashion of the western society. What I haven't been able to find out is, what good purpose this fashion of the modern burkha serves. Mink coats in a western society are a good media to show off to the people, the social standings of the ladies who wear them. And besides

this, they serve the purpose of protection against chill. But burkha, the substitute of mink coats in our society, to the best of my knowledge serves no better purpose, if this purpose is one of the purposes, than to cover and hide the patterns and designs of clothing worn under the burkhas and the hairdos' of our ladies. And a white burkha doesn't serve that purpose too. Besides this if burkhas serve any purpose, they serve the purpose of the fashion of the day and none other. Don't believe me if you don't want to but I can bet anyone a hundred dollars in hard cash, that these things we call burkhas in the east can as good be a fashion craze of the west as any western fashion craze is. All one has got to do is to get Sophia Loren or Liz Taylor or some famed western baby-doll model to introduce it into the fashion circles of their society. And you can watch them grow like wild fire and become as good a craze as *minis*.

Call it a confession on my part or call it anything. But to the best of my belief, any and nearly every part of a feminine physique can stir a turmoil of indecent and inethical emotion. One can learn from the experiences of others too and I have learnt from my personal knowledge of other peoples experience that different parts of the physical build-up of the fair ones have appealed to different men at different times. You must have read poets flood their verses in praise of their *altar egoes* lips, you must have read poets drown themselves in their beloveds eyes and you must have read poets dream sweet and pleasant under the shadows of their sweet hearts hair. And if one happens to glance a little at this commandment of Islam, one will note that these are such appearances of a female physique upon which Islam has not commanded strict observance of pardha as Islam does not call upon the concealing of these for a woman in the presence of her kith

and kin. But then when we see and read in our modern world how these small things have inspired men to write uncountable verses, we are much in a position to realise what pardha in our society should really be. It goes without saying that it should be much more strict than it actually is. I don't know how far it is true, but I heard once from a theology scholar, to whom I was good enough to give an authentic hearing and not dodge him like I dodged my Maulana Sahib, that Islam even calls upon the pardha of voice and asks the Moslem women to fake their voices when conversing with strangers. I have no reasons to doubt the knowledge of this great scholar and if there is a truth in this, as I believe there is, then we can well realise what pardha Islam commands upon our society.

To turn back to burkha, when we look at them and recall the behest of Islam, we can well realise to what extent the burkha serves its purpose and its expectations. We have known many a movie producers and directors to have spent endless money and time in coaching their leading ladies, what according to them is a more graceful and a cultured walk. This is done to attract the public at box-offices and no doubt this formula has proved a great success for the movie makers and a great asset to their bank accounts. Thus we see that a feminine walk, if it is too much made up and not really natural, can cause a hell of an excitement for an uncultured and an adulterated mind. You don't have to believe me if you don't want to. But if you have any doubts, you can well confirm them without much trouble. All you got to do is to take the trouble of getting hold of anyone who spends at the twelve annas gallery at a movie show and ask him what excites him the most in a movie. Don't be surprised if he tells you that he experiences the highest sense of excitement

when some or the other starlight walks her so called graceful walk across the screen. The mystery of the success of this so called graceful walk formula is not difficult to be solved.

In these made up walks of the star-lights, the experts take special caution to see that the walks are the most possible rolled and twisted walks so as to ensure a better prominence of physical movements, and this prominence of movements is a weakness of men. If you happen to have witnessed a model show or a beauty contest you'll know why the panel of judges gave away the first prize. These so called civilized people no doubt consider these rolled and twisted walks to be more graceful but one can never doubt that these walks which make the movements more prominent are the least graceful. And it goes without saying that the physical movements of our ladies, I don't know if they realise it or not, are much more prominent in their modern burkhas than they really are in an ordinary and a simple dresses. To the best of my belief, an ordinary *shawl* over the shoulders and falling quite below the waist can serve a much better pardha than these popularly known, if it is not vulgar to call them that, teddy burkha serve.

Burkhas in these last five years have undergone a magnificient change. Had the change not been so prominent and so conspicuous as it is, so as not to be easily noted, there would have been a lot of reason for us to worry about the health of our women. A father who bought six yards of burkha cloth for his daughter a few years ago would suddenly start worrying about his daughter's health when asked to buy five yards of cloth for her new burkha after all these years. But to the relief of the parent, the father has not failed to notice the vast change in burkha fashions and having noted the change the father can sigh with relief because he can be sure that

his daughter is not losing weight though she asks for lesser cloth piece to make a new burkha.

None has failed to discern the constant change that our burkha has seen during these past few years. And there is no reason for anyone to worry about the health of our women. One might have thought that our women have volunteered to help the *Save Food Campaign* to make Pakistan self-sufficient in food by taking over to dieting, had the recent changes in burkha fashion not been noted. But there is no doubt that our women have not taken over to dieting but it is their burkhas that have really been made to diet and it is their burkha that have slimmed up considerably. Modern women in our modern society have recently started taking special care in using the least possible length of cloth in their modern burkhas and saving every possible inch that can be saved. If any kudos could be justifiably called for, these tailor-masters could be highly acclaimed for such scientific stitching of burkhas which makes every one scratch his head trying to make a head or tail out of it, as to how they succeed in making such tight compartments.

Seeing the changes in the modern fashions, one can well be justified to dread and fear the future and look upon it as an expected dark one. Our society no doubt is going through the same changes that the British society went through a few decades ago. If we happen to be acquinted with the pre-Victorian era of the British society, we shall note that women of that generation of the British covered themselves from head to toe. Women in that age wore knee-low dresses and even covered their faces with a veil of black parlon net that usually fell from over the brim of their hats. And some ladies of good social standings even wore a loose cloak over their shoulders. A

dress an inch too high was met with public scorn and displeasure in that age of the British people. But this was the time when the British stood high in the virtues of feminine decency and gracefulness and thus they had a graceful dress for their ladies. But as the time rolled by, a constant change in the dress of the British nation took a vigourous pace till the present day when the majority of the young blood is a *go* for *minis* and *top-lesses* and a large portion of the older generation accepts the minis as something to amuse their lonely days. These inventions of the fashion artists are over-runners of short-skirt and Bikinis. One can previse and dread the same future for our society too. Our burkhas have started going slimmer and when they reach the climax of it, we can expect them to start going shorter too. And just as it was too late for the British to put a stop to mini-skirts before they became too short, it would be too late for our society to put a stop to mini-burkhas before they become too mini and the heaven only could know what after that.

If we sincerely look at burkhas as nothing in line with the Islamic principles of pardah, which we can do only if we decide to stop cheating ourselves, we can even succeed discovering why burkhas have reached this threshold where they should have never reached. The problem is that a good majority of our burkha wearing women do not really know what burhkas should be and what is the necessity of them. And a good majority of them do not even know why they wear burkhas except that their parents or their families or their husbands families or their society forces it upon them. Such women have no better pretex or reason for wearing burkhas than the justification of forced circumstances. And when the state of affairs is such that a person is told to do something

without being given a chance to know any reasons, the accomplishment of good results is quite impossible as one cannot easily accept and take over the idea easily. I know of a respectable lady, a mother of six, who in her plain innocence flatly proclaimed that she could find burkha endurable only in one sense. Besides this she couldn't find any sense in it. When asked in what sense the burkha was tolerable to her, she did'nt hesitate to say that it saved her the trouble of changing clothes every morning before going to the market for groceries. All she had to do every morning was to put on her neatly ironed burkha over her night clothes and go for shopping and no one could ever dream that she was not properly dressed under her burkha. This she thought was the only one useful purpose her burkha served her. If anyone wants to realise, this example is enough to realise as to what destination and harmful results the lack of knowledge of our burkha wearing women can lead the Islamic concept of pardah. A good majority of our women consider burkha to be an unnecessary weight over their shoulders and a large portion of them consider it to be a necessity of the ancient and preterite world only.

It would be very superficial to arraign and rest all the blame of leading purdah to a degrading and noisome destination on the shoulders of our women. A part of the blame has to be carried by their elders too. The fault for which they should bear the warrant of blame lies in the fact that they have not bothered to register the concept of pardah in the minds of their children. The world today has steered towards westernisation and the myth of westernisation has affected our society very badly. A large portion of our society has encouraged their children to adopt the western ways. The loosening of this grip on our own

culture has had quite nocuose results and the part of our society that still remains unaffected is slowly and gradually loosing the charm of its own culture as the foreign cultures and fashions have started appealing to them too. Until and unless this young generation of our society is made to see the evils of the foreign civilisation, we are destined for an unpleasant doom of moral and ethical standards. The problem that confronts us today is not to see that our women wear burkhas only, but to ensure that they wear them decently. This goal can be achieved only if we talk our women into wearing burkha voluntarily, which can only be done if we succeed in registering the true concept of pardah in their minds and convincing them as to what good it can do to them and to their society. And besides them, the upcoming generation of boys and girls should also be made to realise the necessity of observing pardah. A mother who understands the true principles of Islamic pardah and the necessity of it is bound to talk her own daughters into wearing a respectable burkha and observing a fair pardha much better than a mother who herself knows nothing about it but wears it under forced circumstances herself. A mother who wears burkha voluntarily can succeed more easily into talking her daughters into wearing burkha voluntarily than a mother who herself wears it only because she is told to wear it. It would not be a surprise if the latter goes a bit further in the wrong way to save her child the trouble of carrying an extra burden on her shoulders.

The present burkha, particularly the ultra modern one, in no sense of the word stands true to the expectations of the Islamic pardha. On the contrary it is a good negation befloging the high principles of Islam. Every inch a negation of it. And it is high time that we all opened our eyes to see it

and did something to bring a reform in a proper way and put a stop to the reformations of the present day. This we will have to do if we want to lead burkha back to its respectable position and justify ourselves for having stood true to the expectations of our religion. And this we can do through counsel and advice and not force of will.

To end up, a thought of Foster lingers in my mind. While reading *A Book of English Prose*, I came across Foster's essay, *What I believe*. Foster very bluntly declares that all the great 'actions of humanity occur during the intervals when force has not managed to come to the front. I doubt if Foster ever meant to say what he said in his essay and if he really believed what he said he believed and I doubt very much if he will continue to believe it, if he happens to glance at our society. Foster would'nt miss to see how creatively our women have worked and how great their creative actions have been in modifing the burkha when force upon burkha has not really been in the box.

THE QUIET TRUTH

Self-respect cannot be hunted. It cannot be purchased. It is never for sale. It cannot be fabricated out of public relations. It comes to us when we are alone, in quiet moments, in quiet places, when we suddenly realize that, knowing the good, we have done it ; knowing the beautiful, we have served it ; knowing the truth, we have spoken it.

—A. Whitney Griswold.

M. Zafrullah

A Fallacy Corrected

In Al-Manar, last year I saw very strange and surprising piece of writing under the heading *A Problem* written in very bold letters. Before this encounter (I think the word clash is more suitable here) I thought that every Tom, Dick and Harry knew this problem and was aware of the mistakes that lead to this seemingly correct and unexpected result. But now I realief that I was wrong and I should also say that Toms, Dicks and Harries never know and they always need clear and digested things to stick to. The problem was, Prove that $1=2$ and it was proved in the following way;

$$\text{Let } a=b$$

$$ab=b^2$$

$$ab-a^2=b^2-a^2$$

$$\text{Factorising } a(b-a)=(b-a)(b+a)$$

$$a=b+a$$

$$\text{Since } a=b$$

$$\text{Therefore } a=a+a$$

$$\text{Or } a=2a$$

$$\text{Hence } 1=2$$

Before picking out the mistake commited in the above problem, I should say that Mathematics is a logical system and in logic the reasoning depends upon the premisses, that is, the statements from which the conclusion is to be drawn. If some premise is wanting, that is, it does not reveal the fact or one or more of the premisses are dropped or not considered, the conclusion is not a sound one. Thus to find

out an unquestionable conclusion we have to find out: (*a*) as many premises as we may require and (*b*) the truth of the premisses by analysing them and comparing the split-up pieces with the standard truths. If the requirements of the logical reasoning are not satisfied then the conclusion is either wrong or a fallacy. And it is an astonishing fact that little knowing people condemn Logic for the same reason. With the aid of fallacies they try to prove that logic is nonsense which often leads to results against common-sense. There is a common example which they quote to every person who seems to be inclined to the logical way of reasoning.

They say with contempt in their voice. 'We'll tell you what logic is,' and they proceed with their wicked business saying, 'A horse has four legs and a table has four legs and since a horse can run therefore a table can run and thus a horse is a table. This is logic.'

Once a man of wisdom divided logic into three branches instead of two———deductive logic and inductive logic and the third as reductive logic. This he defined to be the way of wrong reasoning which is so attractive and decorated with beautiful words and phrases that it conceals the truth and emphasizes at rousing words and appeals to feelings than to sense.

This way of reasoning consists of the worst use of the worst words to forward a fallacy as an example of logical reasoning, trying to reduce the value of logic. I am not sorry to use even *harsh* words against the reductive logists in my terminology but I am sorry for the state of mind they are in. Imagine a person drawing the caricature of some great man. In words, you feel the contempt in his voice but I find a hell of jealousy singing in his art. Why?

The great man has done him no harm but our joking friend has hurt his own feeling by thinking, why the other fellow is not worse than he is. And as he can't attack the great person in a reasonable and sensible way because of the man's deeds, he just makes a fun of his habits and his appearance or his face. He would tell you the man's weakness with an emphasis so as to cloud the talents the man had. But why? The answer is that our cartoonist is angry why the man was not worse than he himself is.

Similar is the case of our friends who try to devalue logic. They can't understand the ways which logic adopts. They cant stand the strictness of its reasoning and thus they fall victims to jealousy.

To return to the *Problem*, the problem was put forward to show that Mathematics still has weakness to over come and that Mathematics is not reliable. If for a short time we consider the above to be true then all the Sciences like Physics, Chemistry, Statistics, Economics etc. etc. fall to heaps within the shortest time measure because every science is based upon Mathematical notions and concepts. If we can prove 1 to be equal to 2, then putting a=2 we can prove 2=4 and so on. Had it been possible, mathematicians might have had great losses if some body could prove that 1000=0 or 10000=0. How? just as in the problem;

1=2 then O=2—1=1 i.e. 1=0. ∴ 2=0 and so on

It is possible that the writer might have tried to show that he was the first who noticed this draw back. But I am sorry that this was noticed perhaps centuries ago and the cause was prevented by pointing out the absence of the premise which concludes to the true result and I don't think the writer had taken much pains or he

Prize Distribution at the Annual Sports

Prof. Habib Ullah Khan receiving prize for the Staff race.

Sultan Ahmad Bhatti, the Best Athlete of the year receiving his prize.

was indulged in some sort of reserch work because had he been, he might have read many a book on Mathematics concerning these topics and found what was wrong with his proof.

Now if we pick out the mistake, all the above mentioned fears will drop. I have said before that Mathematics is a logical system of reasoning. It makes use of deductive logic in which we first of all collect all the facts about some problem in the form of statements and then we apply them according to certain laws.

Now in the *Problem* it is given that $a=b$. No objection. Then he multiplies both sides by b. i.e., $ab=b^2$. This comes under the law that if we multiply both sides of an equlity, the equality remains unaltered. Then he subtracts a^2 from both sides, that is, $ab—a^2=b^2—a^2$ This comes under the rule that if we subtract some number from both sides of the equation, the equation remains unchanged. Then he factorises $a(b—a) = (b+a)\ (b—a)$ which comes under the distribution law of multiplication, that is $m\,(x+y)=mx+my$. But now we have to check our equation as $a=b$ we find that $a—b=o$ or $b-—a=o$. After the above step he cancells $b—a$ from both sides. Now the law of cancellation is that if $mx=my$ and m is not *zero* then $x=y$. Now if we consider $b—a=m$ and $a=x$ then $b+a=y$. Then the requirement of rule the is that m i.e. $b—a$ should not be equal to *zero* but actually $b—a=o$. There is a rule that $P\times O=O$ and $Q\times O=O$. P is not equal to Q and as $O=O$ evidently $P\times O=QO$ and if the cancellation of *zero* had been permitted we would have found $P=Q$

Now *first* we have assumed that P is not equal to Q and allowing cancellation of *zero* from both sides we find that $P=Q$ which has been against the fact that it gives rise to the conclusion

that the cancellation of *zero* is absurd or in other words division of *zero* is absurd. I think the absurdity of the process has come to the light which was mainly due to the fact that the writer knew nothing of the rules governing the Mathematical reasoning and so he couldn't bend himself to the strictness of Mathematics and thus he in his own way tried to make a fun of Mathematics.

I might have ignored it as we ignore naughty children pranks but I was afraid lest it should create a general disgust against Mathematics which is the most needed science in the world and which is a necessry tool of research. The general disgust may prevent a genius from coming in the field of Mathematics and to me the loss of a single genius is more than the loss of all the treasures in the world.

Invited Killer

August 16th 1957 dawned hot and along with it brought bad luck for 21 years old Shahzad and his 19 years old wife Nasreen. At 5.30 a.m. that morning, Shahzad and his wife were driving from Multan to Lahore. Shahzad had been home in Multan on a 15 days leave and being an airman was returning to an air-force station in Lahore. Just 20 miles out of Multan, on the road-side, he noticed a young hitch-hiker dressed neatly in a sports shirt and grey slacks.

'Shall we give him a lift?', Shahzad asked his wife. 'I don't mind', she replied. 'he looks okay'. 'He may be another serviceman', said Shahzad. He stopped and shouted, 'How far are you going buddy?'

'Sargodha', the man answered.

'We can take you as far as Lyallpur', Shahzad volunteered.

'Thanks', the man acknowledged, clambering into the back seat of the two-door Cadillac saloon.

The airman wondered at the hitch-hiker's reluctance to enter into conversation. As time passed, he remembered things he had read about hitch-hikers and began to worry mildly. But miles rolled by and nothing happened. So Shahzad and his wife began to relax. The man in the back seat had obviously fallen asleep. Had they known that they had befriended a killer, they would not have been so complacent. Ausaf Khan had been released from prison in 1956 after serving a 3 year sentence on pick-pocketing and later in 56 was convicted for murder and was serving a life sentence in Multan

jail. He had escaped from jail on the third of August. At about 6. 30 a. m. Shahzad read a road sign, 'Lyallpur 40 miles'. Suddenly, without warning, the bonnet of the car flew up in front of the wind-screen. Shahzad jammed the breaks and stopped the car. As he got out of the car to close the bonnet, Nasreen felt something press against her shoulder. She turned and saw, terrified, a pistol in the hitch-hiker's hand. Shahzad slammed the bonnet shut and slid back into the car. As he reached for the ignition keys, Ausaf hit him on the side of the head with the pistol. Shahzad felt a searing pain and blood started running down his neck. 'Do exactly as I say or I will kill you both', Ausaf snarled, his pistol at Shahzad's head. 'Now just drive on down the highway,' he growled and Shahzad obeyed. At the junction of a small country road, Ausaf ordered Shahzad to turn. After a short distance, he asked them to stop and get out. Both did as they were ordered. Ausaf started turning the car and then in the distance he saw a jeep coming towards him. He abruptly stopped, got out and smacked at Shahzad's head—Shahzad fell down and Ausaf kicked him savagely in the ribs and said, 'You bloke get up and open the boot.' Shahzad crawled and did as he was told. The killer gagged and tied the couple. Pushing both of them in the boot, he slammed the lid shut. In a short time Ausaf was driving crazily along the free-way.

In the mean-time Shahzad had managed to free himself and untie his wife. Every breath they took in that cramped position hurt them. Shahzad tried every way to open the boot and finally managed to dent a few inches of it with a tyre lever. From this opening he struck out a bleeding hand in the hope of attracting attention but it did not pay. Upto this time, Ausaf had stopped the car five

times and had attempted to kill Shahzad. But the gun had always failed to fire. After a short time the car stopped again and without opening the trunk Ausaf shouted, 'Listen you two, I am going to stop for petrol and if anyone of you makes a sound, I will kill both of you as well as the filling station attendant' Following this Shahzad went to work feverishly and finally succeeded in forcing the lock of the boot by applying a lever between the spare tyre and the lock. As the car stopped at the station, Ausaf a bit jumpy, felt as if his nerves were poking out a mile. In a shaking voice he barked at the attendant, 'Fill her up.' This was the moment Shahzad has been waiting for and he had planned to make his move now. Slowly and cautiously he pushed the lid up. When the gap was big enough he struck his head out, and to his horror saw the attendant, facing him with a terrified look on his face. The next minute the attendent started shouting for help. Ausaf instantly went for his gun and fired at the man, barely missing him as he dived for cover behind the pump and rolled over to the other side of the car.

Shahzad by now had managed to duck out and close the dickey. Probably Ausaf had not noticed him. He was sweating like hell and his heart beat against his chest so hard that he could almost hear it. Finally he mustered up enough courage and ran around the car. The next minute he found himself face to face with the killer who was all the time cursing under his breath. Without any warning, Shahzad kicked at Ausaf's hand savagely and sent the gun flying across the car's top. The next moment he placed a blow under the killer's heart and another in his stomach. Ausaf tried a move which Shahzad ducked easily and sent another one to Ausaf's stomach with all the force he could gather behind it. That

did it. Ausaf doubled up wimpering. Meanwhile the attendent had called the police. The constable come forward, handcuffed Ausaf and turned to Shahzad, 'What charge would you like us to stick on him, besides the one already valid.' Shahzad, good natured and kind at heart refused an extra charge. He received a little first-aid on the minor bruises over his body and exchanged glances with Nasreen. They obviously were mocking at their stupidity of inviting a killer who had interupted their serene and complacent journey. With this, both of them got into the car and drove off while Ausaf was driven back to Multan, to the same old inviting cell which he had deserted only a few days earlier.

There can be no happiness if the things we believe in are different from the things we do. ———*Freya Stark*

The truth doesn't hurt unless it ought to. ———*B. C. Forbes*

WAKE AFRICA!

What were you, Mother Africa and what will you be,
Oh ! not the same as image clinging on the mind of he,
Who looks down on thee as only a mat for sure,
A despicable lump of soil completely obscure,
Upon which soft and rough feet for ages have tramp'd,
A Dark Continent, unserene, hostile and damp,
No Mother Africa, thats not you, thats you no longer.

A sleeping Giant, you are now awake,
Long confident strides you now will make,
You'll show the world, you'll show your worth,
You no longer grope like a blind in night,
Discover and mend your destiny since times disfigur'd,
Your path to leadership remains bright an' unhinder'd,
All we say—wake Mother Africa, wake oh ! Africa,
Wake thou Africa, lead the world, lead the world.

Editor-in-Chief

S. O. S.—Save Our Souls !

American and pro-American political scientists claim the job of the American President, in the present world of international tension and constant fear of war, to be the most precarious and in a very simple language, the toughest job on earth. They could be right in their conception, but I personally doubt the validity of this claim. My doubt may be wrong. But no matter what it way be, I am not to be blamed as I can not be expected to know anymore about the American Presidency than I already know. How the hell could I be too, when I have neither been an American President nor have I known one personally to know what a job he has at hand.

A man is expected to talk of his own experience and I am going to talk of *my* own. I have had an experience of something and I have had a hell of a bad experience myself. And a damn could I care for how difficult a job Kennedy had or Jhonson is having. I know one thing and what do I care if people say another. All I know is that the job of an Editor of Al-Manar is the toughest job anyone could ever have and anyone will ever have. Believe me or not, but that's the toughest job on earth and you would have definitely seconded me on this, had you but had an opportunity of being an Editor of Al-manar.

I have known people call this post, a bed of roses. But I doubt if roses ever come in sight for miles within the bed of Al-Manar's Editorship. If anyone saw one, I would not hesitate to say that he saw one in a dream, though that too is far from possible. Accuse me of anything, but my

The Editor-in-Chief at his desk

Naeem Osmaan

The Editor-in-Chief has to work hard at the magazine, collecting articles, sorting, selecting, correcting, checking and editing proofs etc. This brings him a lot of criticism but little reward.

four years experience and as an Editor-in-Chief of Al-Manar, I am inclined to believe that editing Al-Manar is no easy a job. It hasn't been easy going with me these last four years. I know some dreamers who call this post, a prize post. But I only wish they could know the price of this prize. You have heard a lot of shop-talk about Editorship from non-Editors. So spare your time a little to know something about it from an Editor's pen and you'll know what price the prize commands.

The problem in our college is that the demand and supply curves of contributions to Al-Manar always show themselves in an unfavourable condition. The worst of all, the already scarce supply of goods to Al-Manar possesses a very scarce utility. The product forwarded to Al-Manar besides being limited in quantity, lacks a quality too. To add a few more problems for the Editors, the sentence construction in these products is very unproductive and to a large extent ineffiecient to produce anything of high market value. And the price determination of these products, under fair and perfect competition, stands below average.

Sometimes, I wish some international agency would organise an annual Oscar award similar to the *Nobel Prize* and thus honour the person who comes across the highest number of spelling, grammatical and sentence construction mistakes during a fixed period of one full year. It would be no surprise for me if I am declared the winner of this award for the current college session and even the last three sessions. I'll even bet with confidence, any nursery class teacher, if she happens to make her pupils write something for her to check, to beat an Editor of Al-Manar in this competition.

My experience tells me that until and unless an Editor

of Al-Manar *stays put* with his knowledge of English, he is destined to forget the spellings of his own name too. My friends have stopped laughing at me and making a joke of me if I happen to mis-spell my name as *Naseem*.

These last few weeks, I have felt like compilling a new dictionary in English with all the spellings I have come across in the contributions to Al-Manar. I know that under ordinary circum tances, this dictionary will be unacceptable, but I'll title it as *New English*. And then I can even expect the University of Panjab to accept it and recommend it to its students. It would be something new and the University may not want to lose the honour of being the first to accept this new English. This I say, because if students here write the same English for a few more years, we are doubtlessly destined to bring a reform in English spellings. And I also foresee the time not far when we wouldn't be able to help forgetting the old English. I have already started soaring the heights and I am already seeing the time, not very far away, when a copy of the *New English Dictionary* will be in the shelf of every intelligent scholar. And *Wow!* I'll be known as the father of the *New English*. I wouldn't forget to express my gratitude to our college students for taking all the pains in spoiling the spellings of *King's English* and thus enabling me to compile a dictionary of *New English*. I might even take the pains of giving these students a special mention in the *preface* and I'll never forget to mention that without the co-operation of these students, the compiliation of this dictionary would have been a concept beyond human thought.

This is one good prize of Al-Manar's Editorship. You get a wide scope of spoiling your knowledge of spellings which no other ordinary student gets. Every article you check, you never miss to

come across a handful of wrong spellings. You may come across these wrong spellings so many times that at the end you'll doubt what the actual spellings really are. The ones used by the students or the ones used by you in correction.

Take the example of the other day. While editing an article for Al-Manar, I came across the spellings of Manager and Sargodha as Maneger and Surgoda. I corrected them for the first few times but the student had spelt them wrongly so many times that by the time I finished checking the article, I forgot the correct spellings myself and ended up with Maneger and Surgoda as spellings of these two words. Call it a confession or anything but I don't care what you say, and I'll say that I didn't forget to consult the dictionary and an atlas to spell these two words correctly, lest I spell them as Maneger and Surgoda.

Bad sentences are consessionable. A little correction here and there, plus a little improvement in the general setting of words can put some better sense in the sentences and make them readable. An Editor of Al-Manar doesn't have to bother with bad sentences. He has to wrestle with sentences that make no sense at all. Seeing these sentences is like seeing a monkey without a head and a tail.

Such sentences if you forward to a lover of English, you can be sure of being accused of blasphemy. Could be I am exaggerating, but try for yourself and try to knock some sense out of this paragraph quoted herein. And don't forget to bear in mind that this quotation is from an article contributed by a final year student of Bachelor of Science. This *Mr. Pre-Bachelor* writes;

'To stop the chain reaction the rods or cylenders were competly dropped inside the water. The apparatus was so sensitive that that could produce exect required number of

nutrons. We asked many questions to the working S. S. O. to whome he gave satisfactory answers. An interesting thing was that there a cran which caved rotate along the raund ceiling and could replace a weight upto to 5 tons in side the buiding Another interesting thi g was that each person working there was carrying as small things which was the size a of burning matchis. Some where out side their clothes. That was an indicator to indicold that how much radialiens that person has absarbed. So that those harmfull rodratien would not exceed a certain limit. After a certain dase warker was giver a holiday to have rest for same timi. To a question as by me that X-Ray having very greate penitrating pawer, so also penitrate through that instrument, then how thase rays would be checked. The answer was that there ..'

This was half of the paragraph and the best of the paragraphs he had written. And this student was good enough to forward 27 pages of such English with 31 paragraphs, none shorter than the one of which I quoted half and having 279 sentences of which only six counted sentences, if we forgive the spelling mistakes, were correct.

And now to quote another small paragraph. Let me see you wrestle with all you brain cells to make some sense out of it. This paragraph is from an article by a student who claimed to be a first divisioner in Senior Cambridge Examination conducted by the University of Cambridge. He also claimed to have obtained a credit in English language from an English University. He writes;

'The Jamia atmosphere has become apart of people's heroic experiences in Pakistan. Cultured and traditions becomes part of our remarkable exciting of real life. For this, it has brought a real picture of mutual understandi.g between the students of Afro-Asian, and create an outstanding

merits in which the pressure on the space, currents the vastly panoramic essentiality of mankind. Its of much calibre and fidelity that whenever such audiences appears to be devotion in its respective manner, let it be communicated, so that the light which twinkles through this canvas can be counted, but the intensity of each cannot be ganged. This is Africa speaks to Asia and Asia same to Africa, and then to the whole world; in order that they can find us how much we are succeeding in creating the afro-Asian personality across the verandahs of brotherhood?' This is Mr. First Divisioner from Cambridge.

The duty of an Editor no doubt, is to check, improve, edit and finally forward the articles in a readable form. But it is a hell of a duty when articles are in the form as above and no better but still worse. It would not surprise me if an Editor of Al-Manar wishes and requests everybody who wants to contribute to Al-Manar, to do him, the Editor, the favour of telling him, what he, the contributor, wants to contribute. And without a formal request, I am sure the Editor would volunteer to write it himself and publish it on the contributors behalf. For me personally, it would be a pleasure to write on behalf of the contributors than check and edit their contributions. Because besides all these troubles, to add up another problem for the Editors, the contributors write in such a hand-writing about which one can do no more but to admire and say *Masha Allah*.

This is of this and that. A lot more could be said and quoted but I fear that after reading all the material contributed by our contributors, you might land down opposite Kinnard College in Lahore. And that is one place, I am sure you wouldn't like going to, if they are going to confine you to the four walls of the mental hospital.

To end up, I'll say I'm mighty poor at thinking. Partly because I was born a half *nut* and partly because these four years have made me somewhat incapable of thinking. I usually avoid thinking because I know I'll have to do a lot of it while doing things for Al-Manar. And after this experience, thinking is no more pleasant to me. At times it leaves me surfeicted and gives me a cronic headache too. Aspro's effect me no more these days. But these last few months I can risk thinking because this being my last term of Chief-Editorship, I am comforted by the thought that I will not have to do any more thinking for Al-Manar. I have been thinking and considering seriously of joining a *primary school* after *graduation.* It should not surprise anyone if I decide in favour of it. I got to learn spellings again unless I want to write a new paragraph in English Language with my personal dictionary of New English and a primary school is the best place to learn spellings.

And, finally a tip for all you. If you happen to be thinking of making some easy *dough*, go ahead and be friends with Editors of Al-Manar. There are at least three of them every year and this can get you a hundred and twenty rupees in hard cash every year. A hundred and twenty *chips* in Pakistan currency is a lot of *dough* for nothing. You wouldn't have to do anything except be friends with the Editor of Al-manar. Don't ask me how three Editor friends can get you all this cash. There is hardly a chance you'll miss it. Editors of Al Manar are destined to go that bad to earn you all this cash if they come across all that stuff that hardly makes any sense. If you still don't get what I am leading you to, then I'll tell you straight and clear. Someone told me the other day that the authorities of the Mental Hospital at Lahore pay forty rupees per person handed over in their custody. And yes, don't worry about me. I already got friends awaiting impatiently to earn a little easy cash.

To the Editor_____!

Sir, You tell too many lies because you say that you encourage boys to write and boys do not make use of this opportunity. But you always discourage me. You never publish my contributions. ———Faizul Haq.

Keep your spirits up. We are publishing your letter. ———*Ed.*

Sir, A Trip Memorable was very disappointing. The article was dedicated to a land-marking journey to Europe by Hazrat Khalifatul Masih Salis. A reader expected more than just a detailed commentary of Hazur's scheduled arrivals and departures. The article failed to serve it's purpose. A lot more could have been given than what was actually feeded. You could have added a lot of spice to the article had you taken a little pain. None could pen down a better article on this trip than Ch. Mohammad Ali Sahib. He knows every detail of the tour and possesses a facile pen too. You should request him to compensate your previous set-back.

———Your's etc.

The article was written on a very short notice and the writer could not get enough time. ———*Ed.*

Sir, Dr. Mohammad Ramzan commended the Editorial Board. The Board must be very pleased with Dr. Sahib's appreciation. Could I commend them for being late with the magazine once again? ———Muzaffar Ahmad

Why forget the students? Should they not be commended for being late in contributing to the magazine? ———*Ed.*

Sir, I never read the Editorial; I could not understand Youth versus Age; my guesses to A Quiz were all wrong; Appreciation meant nothing to me; A Melancholy Songs is not to my taste as I detest sad things; I could not find the meaning of Ad., as in An Attracting Ad., in my dictionary; the Eaves-Drops did not surprise me; the nature does not appeal to me the way it does in the Beauties of Nature because man has spoilt it; A Strange Dream was a strange poem; I am not interested in Leeches; I envy the Smart Ones; I don't believe in doing a little wrong to do a lot good; I don't like reading others letters and thus I did not read those of the Editor; Eternity Lost was full of difficult words and I got tired of consulting my dictionary; The Masters did not mean much to me as I already have too many dramas in my course to bother with one more and I had already read everything about A Trip Memorable in the daily Al-Fazal.

Now Mr. Editor, this was your magazine. You accept fair criticism so accept this and publish this letter. Give us something more than this. I am not satisfied. ———Unsatisfied.

We accept and give you our best———our prayers. God bless you satisfaction. ———*Ed.*

Sir, It was necessary for you to introduce the members of the Students' Union as the students should know their representatives. ———Khalid M. Tahir.

They have been introduced, unofficially before, during and after elections and officially at the inaugration of the Union. ———*Ed.*

Sir, Congratulations for introducing Eaves-Drops. They were

Some selected Basketballers of the College

Shahid Sadi
Central Zone and
Panjab University

←

Tahir Qureshi
Central Zone and
Panjab University

→

Kaleem Ullah
Central Zone and
Panjab University

←

Zabeeh Ullah Bubby
Central Zone and
Lahore Board

←

Munir Ahmad
Lahore Board

→

very interesting. Please introduce some more such columns which can be readable, interesting and also paying.———Anjum Riaz.

Sir, Please accept my letter in good faith and with sportman's spirit. You grumble too much Mr. Editor. Students' don't co-operate with you, then what? What are your appointed Editors for. You can't stop giving us regular issues if we don't contribute for them. Then why grumble? So what if I don't give a contribution and don't co-operate? You will still have to give us Al-Manar. ———Zafar

So nothing. But did you ever hear them say, 'Those who do by the inch but ask by the yard should be kicked by the foot.' Please accept the reply in good faith and with sportman's spirit. ———*Ed.*

Dear Editor, My Alma-Mater and her mixed associations have always been finding a place in the rugged list of my memories. I am sending a few lines for consideration to be accommodated in the next issue of Al-Manar.

———Rafiq A. Akhtar, West Germany.

We appreciate the spirit of Mr. Rafiq and expect our students to follow the example when they leave the college. ———*Ed.*

Sir, Though the magazine is interesting it does not cover the college and hostel activities. Would you kindly provide us with a round-up of college activities regularly in future?

——— *H. R. Mbano*

We can't promise a round-up regularly. But we are providing you with one this time. ———*Ed.*

Hemeidy Mbano

Mona, my Mona

Sorrow and despair were all I knew,
Days and months were years to me,
Even the guests were scarce and few,
The reason I knew, the reason I knew.

For months and years I had wept,
To see my Mona even for a second,
But all my hopes were swept away,
As the hurricane sweeps the sand away.

I tried to forget her but all that failed,
I tore her photos but ended in weeping,
Her letters I kept, my heart they comforted,
And when I read them they stopped my weeping.

After writing to her, begging her return,
I heard that she was soon coming home,
I bought new curtains for her room,
To make her happy when she would come.

And the very day I ceased to care,
It was the day Mona came here,
Though I welcomed her in a friendly manner,
I surely didnt love here any longer.

Usman Akbar

The First Sight

She won my heart the very first day I saw her walk stately across my house, her spotless white fur coat sparkling the radiance of the stately shapeful figure. She walked with her head high, her chin not much but perfect in the air, and her eyes, which later I was to learn were deep blue, straight on the tarmac. She walked a calculated walk, as much full of grace as any monarch had ever walked to the crown on her coronation.

I stood there, numb, watching her walk all the way till she was finally out of sight. But I don't know when she got out of sight. It was my cigarette that brought me back to my senses. I was as good as soaring the heights over Everest. I was on the top of the world till the cigarette burnt my fingers and broke that pleasant chain of thoughts.

Boy ! She was something. I registered her in my mind and I even dreamt of her for long after that. Even during the moonless dark nights. And people say moonless nights are not romantic. She as good as haunted me night after night. Moonless or not.

An then I waited for her. Waited for her till my prayers were granted. And this time it was much closer and much clearer. She was there, just outside the big gate. I stood paralysed, it was her. The same old her. She wore the same dress and carried around her the same air of superiority and pride that had nearly killed me on the first sight.

I wanted to see her. Admire her. But I could not. I could not because my eye muscles got as badly paralysed as all my other muscles. I just started at her and then she was gone. Like fire she was.

I felt sorry. Very sorry. Yes, very sorry till I saw her again the next time. And this time, she let me know her house too. I cursed myself for not knowing it earlier. It should have known it earlier. I could not imagine how I had missed knowing it. She was my neighbour.

It was not long after that that she started paying me visits at my home. She used to sneek into my room. She walked on cat-paws and no one could ever know. She always walked soft. She would come and we would sit for hours. Words were never spoken. But things were said and lot of things were said between us. Our eyes did the talking. She understood mine and I understood her's. For long hours we would sit and our eyes would talk. But then the sun was not always our friend. It would bid us good-bye and she would bid me good-bye just after the sun. Ah! yes, I loved the way she did it. She would get up from her *comfy* warm abode in my room, stretch her hands and shake herself a bit and then without a word spoken but with the promise of the coming day, she would sneek out of my room on cat-paws and back again to her home. I always felt sorry when she left. I always wanted to stop her but I never could. And thus I always tried to please myself with the thought of the coming day and I got somewhat contented. I could not ask for more.

Then it was as it always is. My neighbour got wise to our meeting. He got aware to the fact that she has been sneeking into my house and he suspected her for some

mischief. But he was very wrong. She was not at all like Macavity. She never got to mischief in my house. All she used to do was to pay me a stately visit. But my neighbour got wiser to the situation and put a stop to everything.

She, I learn from my neighbour, has been taken into oblivion, till she forgets every part of memory in my rememberance. I feel lonely but my neighbour will not listen to a thing. I feel alone in this vast wild world. My eyes are dry and she is not there to sooth them. She had as good as become my life. She as good as pumped my heart in her body. Call her a mistress or call her anything. But I call her my love. Yes, that is what she was and that is what she is and that is what she will be, even though my neighbour does not like it. I called her Rosy and I will call her that. She will always be that even if my neighbour calls here pussy.But she is not a simple pussy cat for me readers. She is my kitten, Rosy.

Another Ball in the Basket

Kudos to the executive Committee of the 10th All-Pakistan Nasir Basketball Tournament for bucketing yet another success with the successful accomplishment of the 10th All-Pakistan Nasir Basketball Championship, held at Rabwah in the second week of February this year.

The show was pomp as it always has been and the tournament did not fail to witness a lot of good game too. To the disappointment of many, the champions of the previous year did not participate in this year's tournament. But thanks to Fl./Lt. Akbar Chaudhry's co-operation that the old tradition of the tournament committee, to call upon the Captain of the reigning champions to declare the tournament open, was held true this year once again. Sixteen teams in club section, six in college section, two in school section, plus four teams of biddies section participated in the tournament.

Among teams that gave an outstanding performance, P.W.R. Lahore, West Pakistan Police Lahore, Fazal-e-Umar Club Rabwah, Brothers Club Lahore, Hailey Club Lahore, T. I. College Rabwah, Law College Lahore and T. I. School Rabwah deserve special mention. Fazal - e - Umar Club, Rabwah, inspite of a clean, cultured and a magnificient game, lost in semi-finals to the West Pakistan Police. A little more practice by the first five of this club can promise still a lot and it would not be a surprise to anyone if a couple of players from this club get an opportunity to prove their worth on the list of the Pakistan national side.

Among matches of special mention was the match played between Young Friends Club and the Friends junior teams. Being a match of the Biddies section, the kiddies were graced a ten minutes time in the West Court, between the school and college section final matches. The kids of both the teams stole the show and did not lack a game to impress the spectators as well as the participating teams. No doubt, the well wishers of Basketball can look upon these kids with high expectations of the future.

Talimul Islam School, Rabwah, beat their opponents the Government Polytechnic School, Lahore with a landslide margin to win the School Section Championship and TIS. boys did a lot to compensate their previous year's set-back.

Among college section, Talimul Islam College, Rabwah, did not miss to win the top honours after beating Law College, Lahore. It would be doing injustice to every player of T. I. College team if special mention is given to one and the rest neglected. T. I. C. boys played the best possible game in all their matches.

Naeem of Law College Lahore deserves special mention from his side for being an outstanding player of his team.

Pakistan Western Railways played a magnificient game to regain the championship they lost last year to P. A. F. by beating the West Pakistan Police in the final match of the club section. Javed Hasan, Captain of PWR and also Pakistan National team captain, and Albun of W. P. Police deserve special mention for their excellent performances.

The final session of the tournament was attended by many high dignitries and also the elite of Rabwah. The chief guest on the occasion was Mr. I. U. Khan who had specially come to Rabwah to witness the final session. Mr. I. U. Khan also distributed the prizes on the conclusion of the tournament and graced the audience with a few words.

Sticking to its old traditions, the people of Rabwah and the authorities of Talimul Islam College, Rabwah, gave two grand dinners in hononr of the visiting teams. The 10th All Pakistan Nasir Basketball Tournament was another successful bucket for the Tournament Committee.

The Heroes of Ravi

At the beginning of every academic year, the Universities of Oxford and Cambridge take upon themselves the responsibility of selecting a number of good oarsmen to lead the boats of their respective Universities to success in the rowing championships between the two English Universities.

Though miles away from the scene of the rowing competition between the Oxford and the Cambridge Universities, the Punjab University holds its own rowing competition at the Ravi. But unlike the British Competition were the compatitors are two seperate Universities, the competition at the Ravi is between the teams of different colleges affiliated to the University of the Punjab.

Talim-ul-Islam College, Rabwah, has always maintained two separate rowing teams of its own and since the last few years, the T. I. boys have won a long list of championship in the Board the University Tournament held by the Board of Intermediate and Secondary Education and the University of the Punjab respectively.

This year, to the disappointment of the T. I. students, the junior rowing team of our college got itself bumped on the final day of the competition but to consolidate the previous reputation of the T. I. Rowir.g Teams and the set-back of their Juniors, the T. I. Degree Rowing Team boys strained their muscels to row their Boat to success and thus win the University Rowing Championship for their college. The Talim-ul-Islam College looks upon these heroes of the Ravi with pride.

Safdar Anwar
Captain Degree Team

Masood Niaz
Captain Board Team

Members of the Panjab University Champion Rowing Team.

Anwar Kahlon

Nawaz Kahlon

Zubair Vaince

Masood Malhi

Waseem Ahmad

Munawar Bajwa

They Discussed Asla and Jazba.

Punjabi debates have become an annual affair with the Students' Union of our college. For the second time in the history of our college union, we held our All-Rabwah Punjabi debate this year and to the best of my knowledge it was the first time that a sensible topic had been forwarded for discussion.

Jang aslay nal nai jazbay nal jitty jandi ai was the proposition forwarded by the winner of the first prize in the last year's Punjabi debate. *Safeer-ul-Haq*, acting as the leader of the house did not lack *asla* for his opening speech but inspite of all the *asla* he managed to carry only the *consolation prize* in this debate. The proposition was opposed by *Majid Ahmad Tahir* who to the surprise of the house, contary to his own stand had a lot of *jazba* which favoured him to carry the *first prize*. Among others who deserve special mention are *Naeem Osmaan* who won a *second prize* again this year in the All-Rabwah Punjabi Debate. Osmaan spoke in favour of the proposition and the reason of his success can be counted on the shoulders of his *jazba* to dare a Punjabi speech. *Arshad Mahboob* speaking for the first time in Punjabi carried the *third prize*.

The students union can no doubt count upon a number of speakers to win appreciation for the college in Punjabi debates. This is what has been proved by this year's Punjabi debate which to a large extent was a better success than the previous All-Rabwah debate.

Naeem Osmaan

That Lass!

With steady and steps slow she came on board ;
Her limpid eyes cut thro' me like a sword ;
Some thought in me did say I knew the lass ;
As memory did star and past enlightened—Alas !
My heart and soul both did play a lepid jazz.
Begone it was we walked together and together sat ;
And then it was but Ah ! those days are gone ;
It was but the kid I knew she is but a lady full grown.
The kid I knew she's today a lady full of grace ;
Childhood she left and of it she brought with her no trace ;
I looked agoge and watched that flow of her majestic steps ;
More august neither seen nor for times to be seen perhaps.
Beneath the spotless canvas of the clear blue sky ;
Above the stretch of the endless blue ocean ;
The figure upright of a lady ingrate yet well bred ;
The day's in full in and out the lonely deck tread.
The sight of her's in days did sooth my lonely eyes ;
I couln't though I wanted much to forget our begone ties ;
The rising sun its hazy beams found me awake ;
The thought of her's in night and day I couldn't shake ;
To see that lass—that limpid lass—I waited for none ;
Neither sleep to go nor cukoo to sing—I was up before the sun.
But then the sun did finally lean across the bossoms of the west ;
And I lost the sight that my eyes and I myself loved the best ;
My eyes did fill to the brim their cups with tears ;
And off my senses I was as if like Bacchus drunk ;
The words can't express and the lonely eyes can't chalk ;
The day she finally did walk away her stately walk.

Eaves-Drops

—*From the college notice-board ;*

"The Chawkidar has been relieved off his services. Till the new Chawkidar is appointed students are advised to guard Their Bicycles unless college takes no responsiblity if any loss is done."

—*A B. Sc. student writing for the magazine ;*

There were fifteen students and one cooker with one Professor Dr. Nasir Ahmed Khan the incharg of our Party worthy Dr. Sahib had arranged all the things and had recieved the visiting permission from the Directors of Mangla Dam, Nuclear Reacter and Wah Industris. The different objects were alloted to various students, so that they should realize their responsibilitis.

—*The same student again ;*

Our cooker got himself bussy in cooking.

—*A student asking for a copy of Al-Manar ;*

Let me show please.

—*A letter with the permission of the recipient ;*

Dear—Hi I am very very busy, so I can not write you the letter. Thank you for your picture. Next letter I shall send my picture, please send me your ordinary picture. Have you receive my post card ?—Your always friend.

—*A President declaring a debate open for discussion ;*

I begun the debate open, the favour of the house—

—*Overheard at the hostel ;*

'Why don't you study Mr. Senior Cambridge ?', asked a tutor.

'I have studied, Sir. I have become headache now,' replied, Mr. Senior Cambridge.

—*Overheard—a conversation between two college students ;*

'Where have you gone Mr. B—? I did not see you many days,' inquired Mr. S—a final year under-graduate student.

'Oh ! I have been around the college', replied Mr. B—, an intermediate first year student.

'You have been taking rounds of the college,' asked Mr. S—. the under-graduate, quite surprised.

—*A B.Sc. student reporting a tour to Mangla ;*

We were very much astonished at the bravery of the driver and stuffness of bus, as it mounted on indication of not less than 45°, continuously for about 500 yards to reach up the villey.

—*The same student reporting a trip to Murree ;*

On 25 april our trevelling maneger monaged for a Bus and food maneger for the ration of the lunch at the merry hills. The high way was very pleasing as well as dangerous for a tourest and a cowerd man respcctively.

—*From the hostel notice-board ;*

Annual cleaneness competition is going to commence in the current week. The final inspection shall be on 19th Feb. Residents are requested to be furnished. Competition between indivudual seats, cubicles. Darmetary. Anxys shall be entertained seperate from main hostel (including research).

—*At the college notice-board ;*

Malik.....XII. pleas see me Emediately.

—*At the hostel notice-board ;*

It is recomended that the following students be called for warning for not deserving the study time with strictness and sleeping during study hours——

And the following for talking and walking during study hours.

HELLO MR ER.....

Every now and then you come across such a person whom you think you have seen somewhere. I am one of such persons, wherever I go, I am always to find someone who has seen me somewhere before. I don't know what is wrong with me. I am of a normal cut and have no unusual features. Yet wherever I go, ladies faint taking me for a notorious killer and men rise thinking I am some so-and-so minister or some respected person of that area. I am fed up of all this co-incidental recognition as it is getting on my nerves. Only the other day I was returning home after a long day's work. As I had missed the last bus, I had to walk the two miles to my house.

Just near my house I dropped into a restaurant in order to freshen up. My wife was used to my being in perfect spirits and if unfortunately someday I was not, she would as a gesture of dissaproval order me to do the dishes. And I always wanted to keep away from them.

Just as I entered the restaurant, a young woman got up from a corner seat and stumbling towards me she started weeping and mumbling something of which I only got the following, 'Dear where have your been for so long, I have been waiting for you all this time.' Goodness me !. She had taken me to be one of her boy friends. I don't know what happened after that, but I remember this much that I succeeded somehow in seating her and on the pretense of spending a penny I slipped out through the employees entrance.

The first thing I remember after reaching the street was that I was sprawled on the side-walk with a man

kneeling besides me and offering me his most humble apologies. The wise-crack had poked me in the eye mistaking me for a person who had fixed him up the other day. I got up quickly and covering my face with a news-paper ducked through the alley towards my house. On the way I heard a couple of people shouting at me, 'Hello Mr. Er...'. But I dis regarded all of them and sneaked through the back-door into my room and crawling into my bed I called it a day.

Now what happiness do you expect for a person who gets into such a fix nearly every day. Once during an air-flight, the passenger seated next to me took me for a big foreign industrialist and started discussing the prospects of a joint refinery enterprise. I slept the two hours he jabbered as I didn't have the heart of disappointing him. As soon as I got off at the airport the police dragged me off as a suspected gangster. The stewardess aboard the plane had tipped them off. They kept me locked up for three nights.

Just imagine the time when one day after dinner I was strolling towards one of my favorite night-spots. As I ventured into the lobby of the place, a smart looking gentleman got up from his place and started towards me. I ventured straight out. Here I was encountered by a photographer who was insisting on a snap and said, 'How about a smile, Mr. Governor.' I d u c k e d and made off to another isolated hotel. At the counter, as I was paying the cheque, a hand rested on my shoulder. I looked back. An elderly man looked at me, straight in the eyes and said. 'Haven't I seen you somewhere before Mr. Er———'. 'You have never seen me before,' I snarled, 'Go to hell and blow off'. The man hesitatingly started away, a hurt expression in his eyes.

Munawar Anees

Language Speaks Itself

Biology students are often confused and harrassed by the terminology of the subject, for most of the terms comprise from 15 to 20 letters and are difficult to pronounce. They try to cram it but face an utter disappointment when their memory refuses to work like a computer. They rarely remember the distinction between *biological antonyms* and thus intermix them. Newly commissioned students face a greater trouble than the senior ones, for not being familiar with such terms.

Biological language is derived mainly from Greek and Latin languages and by using Greek and Latin prefixes and suffixes or both, we get the required terms. Do not consider it a *genetic malformation*. If you think over these terms, you will conclude that by doing some variations here and there in the original languages, we have the best possible *generation* of words in hand.

If you break lengthy terms into small units and consider each unit separately, you will know that this breakage gives you many news about an organ's location and function in the body. By learning some major prefixes and suffixes along with their meanings you will not accuse your memory for not being computerised. It will become very easy for you to learn the vague terminology and fair understanding of their meanings will lessen your text burden. These hidden units will determine mastering of text pages for you. The minute structural and functional detail of the body organs will become very simple, for these terms serve both the purposes.

Let us decode these units of information and see how language speaks itself !

Proteus was a Greek god who continually changed shape. We see that *Amoeba proteus* also continually changes its shape by the help of *Pseudopodia*. So the name is Amoeba proteus. Pseudo (G) means false and podia means feet. Are'nt pseudopodia the false feet of Amoeba ?

In Latin, ramus means a branch. Each sympathetic ganglia in frog is connected with the correspoding spinal nerve by *Ramus communicans*, which speaks of itself.

The gatekeeper in Greek is called pylorus. *Pyloric sphincters* actually do the job of a gatekeeper blocking the entry of unauthorised food stuff into doudenum.

Pons Varolli is a white convex mass of nerve tissue at the base of the brain which serves to connect various lobes of the brain like a bridge, and actually Pons (L) means a bridge. Varolli—the name after an Italian Anatomist, Constantine Varolius (1543—1575).

Frogs can not endure the chilling cold of winter. They undergo a period of suspension during winter season. Hence the name given to this period is *Hibernation* (L) which means to pass the winter.

An x-shaped structure is formed by the crossing of optic nerves. Optic (G) indicates something pertaining to the eye and Chiasma means a cross. Do you consider *Optic chiasma* a meaningless term ?

In Latin, *Foramen* means an opening. Lateral ventricle of each cerebral hemisphere communicates with the third ventricle through an opening called Foramen of Monro. (Monro was a biologist).

Assimilation (L) means similarity and we see that non-

diffusible food becomes diffusible and similar to that pre-existing protoplasm due to metabolic activities. Hence the process is called Assimilation.

In Greek, *Sperma* means seed and *Zoion* means a living being. *Spermatozoon* is really a living seed which after uniting with *ovum* gives rise to *human buds* which develop in a human being in due course.

Afferent (L) means to bring, and the name is given to sensory nerves which pick up the sensation through their antenna like *dendrons* and transmit to the brain. *Efferent* (L) means to carry away and the name is given to motor nerves which relay the intelligent commands of the brain to the organs involved.

Zygote (G) means marriage tie or other bond of union. Isn't really a bond of union resulting from fertilisation ?

Mitosis (G) and *Amitosis* are terms employed in cell division. During amitosis which is characteristic of protozoa, chromatin network remains intact and during mitosis, nuclear material splits up into thread like structure the chromosomes. If you consider the meaning of these two terms you will have no doubt about their justification. *Mitos* means thread and *osis* means condition. We can define amitosis as without thread condition and really it is so.

Chromosomes (G) are deeply stained when subjected to biological stains. Chroma means coloured and soma means body. Hence the name chromosomes.

Turgid (L) means to swell. Doesn't the plant cell become swollen due to osmosis ?

Mandible (L) stands for jaw. Hence the name given to all nerves and arteries or veins supplying or originating from jaw, e.g. mandibular nerve and mandibular vein in frog.

In rabbit, *Ceacum* ends distally in a narrow blind tube, i.e. *Vermiform appendix*. Vermiform (L) indicates its worm like shape and appendix means some sort of appendicular structure. Isn't so the case actually ?

A mass of twisted tubules lies on each side of the testis in male rabbit, i. e. *Cauda Epididymis* and *Caput Epididymis*. Caput epididymis is towards anterior side and Cauda epididymis lies towards the posterior side. Caput (L) means tail. Epididymis (G) means on the twin. Don't these structures lie on a pair of testis ? After knowing the meanings of these terms you will not intermix their location.

Oculomotor is a term defining a nerve in frog. Oculo (L) means pertaining to eye. If incidentally you forget the function of this nerve you will be helpless. But an understanding of the meaning of the term will give a spark to your memory and you will not be in trouble. Oculomotor simply tells us that this nerve supplies to the eye and is motor in nature.

Consider the *Pulmo-Cutaneous* artery that supplies to lungs and skin. Knowing the meaning of term you will not complain of you memory. Pulmo (L) means pertaining to lungs and cutaneous (L) means pertaining to skin. The double structure of the term also indicates that it bifurcates. Same is true with *Occipito-Vertebral* artery. Whereas Occipito (L) means back of head and vertebral indicates vertebral column.

Here I have given you a few examples to explain how to do the breakage to know about the hidden units of information. By considering the terms and trying to know the meanings of these terms you will feel no trouble to master this subject.

These terms give you a lot not only about the function but the location of the body organs too. By employing the breakage technique, the study of Biology will become very interesting for you and you will not consider these terms as vague or ill defined. These terms are applicable wherever you find any biological reading matter. A fair understanding of these terms will be very useful for those students who intend to seek admission in medical college as they will find many such terms and their various derivatives in their text. They should emphasize on those terms which define the function or location of major body organs so that they may be able to understand other derivatives of those terms.

• • •

Abbreviations used :—

(G) Greek (L) Latin

References for further reading :—

Pocket Medical Dictionary By Nancy Roper
Published by English Lanuguage Book Society, London.

A Dictionary of Biology By C. J. Hickman & M. L. Jhonson.
Publishers the same as above.

College round-up

Rowing Victory :

In the Panjab University Bumping Boat races T. I. College bumped Hailey College of Commerce, Lahore to win the first position and gloriously maintained it to the end of the tournament. Our team thus regained the University Championship which we lost to the Hailey College the year before last. Students enjoyed a holiday by virtue of this victory. The college is proud of such great players as Safdar Anwar, Mohammad Nawaz Kahlon, Mohammad Anwar Kahlon, Zubair Ahmad Vains, Waseem Ahmad and Masood Ahmad Malhi who did not spare even his blood for the sake of his college by getting his arm broken by a rival's—stoning

Basketball Championship :

At the All-Pakistan Nasir Basketball Tournament our college won the championship in the college section. In the club section P. W. R. had to fight hard to defeat the West Pakistan Police in the final match of their section. Talim-ul-Islam High School, Rabwah were the champions of the school section.

Nine players from T. I. College were selected to represent the Central Zone Basketball Association (CBBA)

Glimpses of the Annual Sports

Some of the winners on the victory stand.

The Acting Principal distributing prizes among children of staff.

in the National Championships. They are, Latif Ahmad, Naseer, Kaleem, Shahid, Babbi, Tahir, Majeed, Akram and Abdul Lateef.

Annual Athletics :

The annual Athletic Championships of the college were held on the 5th and 6th of the March 1968. Although his blessings were there, the worthy Principal himself could not to personally present on the occasion. Professor Basharat-ur-Rahman did all the work for Qazi Sahib.

Sultan Ahmad Bhatti of 4th year was adjudged the best athlete of the college for the year 1967-68. He has obtained this honour for the second successive year. Besides other usual events, staff and staff children races were interesting for the spectators. In the staff race such elderly men as Khan Habib Ullah Khan and Malik Mohammad Abdullah tried and probably succeeded in establishing their athleticism in spite of the doctor's advice to avoid all youthful activities. Khan Sahib himself and Malik Sahib's babies were awarded prizes over their performances.

Hostel Function

The Fazal-e-Omar Hostel Annual Function which was arranged on the 25th of February, 1968 was a practical exponent of the Warden's great qualities of head and heart.

After a wholesome dinner, a sort of a variety programme which depicted the ordinary features from every day life, were presented. Some of the college activities were dramatized. The students took advantage of the occasion and ridiculed, in quite an innocent manner, the way they are sometimes treated by the college. The hostel mess, the tuck-shop, the college dispensary and staff cycles offered frequent target for the students' ridicule. Without being morbid or indecent the boys not only gave vent to their suppressed feelings but occasionally they were didactive and suggested improvements. It is not easy to provide entertainment without being cheap, to give an outlet to the youthful emotions without over doing, to ridicule without offending and to combine joke with decency. We congratulate the residents and the worthy Warden on this brilliant performance.

New Appointment

In order to improve the efficiency of the Urdu section against which there have been complaints among students and the other concerned circles, the Principal has transfered the charge of the Urdu section of Al-Manar to Ch. Mohammad Sharif Khalid, M. A., L. L. B., who has started working hard at it. Let us hope and pray that Khalid Sahib succeeds in reclaiming the brilliant traditions of the Urdu section which in the past has repeatedly failed to keep company with its counterpart in English.

All Pakistan Debates

The Students' Union held its 14th. All Pakistan Inter-Collegiate English and Urdu Debates on the 15th and 16th of March respectively.

Although the topic of the English debate, '*Right is Might*' did not attract many speakers yet the quality of speeches was heartening. *Naeem Osmaan* acting as the Leader of the House forwarded the proposition and *Sarwar Zaidi* opposed the proposition in the capacity of the Leader of the Opposition.

According to the decision of the panel of judges, *Mr. Imran Aslam* of Government College Lahore secured the top position. *Mr. Zafar Nazir* of Government College Lahore and *Mr. Naeem Osmaan* of T. I. College Rabwah shared the second position. The third and the consolation prizes went to *Mr. Shahid Rashid* and *Mr. Safdar Hussain* of Murray College Sialkot. The trophy for the English debate was awarded to Government College Lahore.

The topic of the Urdu debate,

اعلی تعلیم ذہنی انتشار پیدا کرتا ہے

'*Higher Education leads to mental confusion*' was put forward for discussion by *Majid Tahir* and the opposition was lead by *Safeer-ul-Haq Rama*.

Mr. Sahibzada Jamil Latif of Law College Lahore, secured the first position in this debate. The second, third and consolation prizes were awarded to *Safdar Hussain, Zafar Iqbal* & *Farid Ahmad* respectively. The trophy for this debate was awarded to Government College Jhelum.